تحریفاتِ کربلا

آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ

شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)
www.shaheedmutahhari.com

تحریفات کربلا

تالیف:
اُستاد شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجم:
سید غضنفر حسین البخاری

شہید مطہری فاونڈیشن لاہور پاکستان

نام کتاب: تحریفات کربلا

مؤلف: اُستاد شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجم: سید غضنفر حسین البخاری

کمپوزنگ: انس کمیونیکیشن 0300-4271066

ناشر: شہید مطہری فاونڈیشن لاہور پاکستان

زیرِ اہتمام: ابوظہیر

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0321-4971214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

0333-5234311

فہرست

عرض ناشر 6
پیش لفظ 7
مجلس ا ل 9
فصل اول: 9
فصل دوم: 10
فصل سوم: 10
فصل چہارم: 10
بحث اول:۔تحریف کیا ہے؟ 10
انواع تحریف 11
تحریف لفظی 11
تحریفِ معنوی 11
سادہ لوح ذاکر 14
تحریف لفظی 18
یہ زہر مار.....؟ 21
جھوٹے ٹھاٹھ 24
غیر حاضر موجود 25
علی اکبر علیہ السلام میدان میں 26
جناب لیلیٰ کی عجیب وغریب نذر 27
محاذ جنگ میں عروسی 28
اور یہ کیا ہے؟ 30
تحریف معنوی کی اہمیت 31
عاشقِ خدا 34

مجلس دوم.......... 38
عوامل تحریف.......... 39
عامل دوم.......... 40
افسانہ ساز عقیدت مند.......... 42
عامل سوم.......... 46
مجلس عزا کیوں؟.......... 47
من گھڑت!.......... 50
لانے کا عجیب طریقہ.......... 52
شمر کا اَمان نامہ.......... 59
ابوالفضل فرات پر.......... 60
مجلس سوم.......... 64
تحریف معنوی کیا ہے؟.......... 65
عبداللہ بن عمرو عاص.......... 67
اسباب تحریف.......... 68
قیام مقدس کی دوسری شرط.......... 69
انقلاب کے تقدس کی تیسری شرط.......... 72
قیام حسینی علیہ السلام کی تحریف.......... 74
مسخ شدہ ہدف.......... 77
فتحیاب کون؟.......... 79
ذکر اہلبیتؑ رسول کو زندہ رکھنے کی ضرورت.......... 80
دشمن بوکھلا گیا.......... 85
امام کے عجیب خطبے.......... 86
مجلس چہارم.......... 92
ا۔تحریف کا ذمہ دار کون؟.......... 93
امام ششم علیہ السلام سے استفسار:.......... 94
بہشتی ڈاکو.......... 97

۲۔تحریف میں مضمر خطرات 98

امیر المومنین علیہ السلام کی غلط تشخص 100

عابد بیمار یا عابد مجاہد!۔ 101

افضل کون؟امام یا ماموم 104

امام بیمار کا شوربا 105

ہمارے فرائض 106

علماء کے فرائض 107

مجلس پنجم 116

مقصد قیام حسینی علیہ السلام 118

آئمہ دین کی تاکید 121

متوکل کے مظالم 124

حقیقت استفادہ 126

قیام حسینی علیہ السلام سے استفادہ 127

پند وموعظت:۔ 132

۲۔تعلیم مصالح دینی ودنیوی:۔ 133

ا۔تبحر علمی 134

۲۔اخلاص تبلیغ 134

ہدایت کی حقیقت 135

ہادی دین کی حقیقت 137

اخلاص 143

ا۔پہلی قسم 145

۲۔دوسری قسم 146

غبار نجات 147

۳۔اطلا امت برائے احوال مسلمانا عالم 148

اسلام کو درپیش خطرات 151

عَرضِ ناشر

تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جو ہمارا خالق و مالک ہے اور اسی کی عطا کردہ توفیق اور اسی کا فضل ہے کہ شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ کے آثار و افکار کو جمع کر کے شائع کرنے کی کوشش میں کامیابی کی طرف رواں دواں ہیں۔

''تحریفات کربلا'' ایک بہترین کتاب ہے جس میں استاد شہید نے واقعہ کربلا میں ہونے والی تحریفات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ کتاب کے متعلق کچھ بھی کہنا سورج کو چراغ دیکھانے کے مترادف ہوگا۔ ہاں اس کے بارے یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کتاب آپ کو حقائق تک رسائی میں آپ کو بھرپور معاونت کرے گی۔

ہمیشہ کی طرح ادارہ شہید مطہری فاونڈیشن آج بھی آپ سے درخواست گزار ہے کہ اگر کتاب میں کسی قسم کی غلطی پائیں تو اس کو انسانی فطرت سمجھ کر معاف فرمائیں اور اس کے بارے میں ادارہ کو آگاہ کریں تا کہ آئندہ اس کو درست کر دیا جائے۔ اور اگر آپ کے پاس شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی کتاب موجود ہوتو ازراہ کرم ہمیں ارسال فرمائیں تا کہ اس کی اشاعت کا بندوست کیا جائے اور یہ عمل یقیناً یہ ہمارے اور آپ کے لئے دنیا اور آخرت میں نجات کا باعث بنے گا۔

انتہائی مسرت سے اطلاع دی جارہی ہے کہ شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ کی شائع ہونے والی تمام کتب www.shaheedmutahhari.com پر مطالعہ کے لئے پیش کر دی گئی ہیں۔

پیش لفظ

مدتوں میں معصومین علیہم السلام کی پاکیزہ اور قابل صد فخر سیرت پر تہمتیں اور افترات سن کر خون جگر پیتا رہا۔

سالہا سال میں نے ان عصمت مآب ہستیوں سے منسوب نامعقولات سنے اور جب کبھی صاحبان علم وعقل سلیم سے ان کی حقیقت کے بارے ''روضہ خوان حضرات کو جاننا چاہئے کہ سب سنی یا پڑھی ہوئی عبارتیں قابل نقل نہیں ہوتیں۔''

اس بارے میں میں ہمیشہ ہی شدید قسم کے ذہنی کرب سے دوچار رہا اور اللہ تعالیٰ سے کسی ایسی خدمت کے لئے توفیق طلب رہا جس کے ذریعے تشنگان حقیقت سرچشمہ ہدایت تک پہنچ سکیں۔

تا کہ میں تو تھا ہی ایک دن توفیق ایزدی سے اسی موضوع پر استاد شہید مطہری کی چند تقاریر کے کیسٹ سننے کا موقع مل گیا۔ یوں سمجھئے اندھے کو آنکھیں مل گئیں۔ جو یائے زار کو آخر کار گوہر مقصود مل گیا۔تقریروں کا مواد عین میری مراد کے مطابق تحریف اس کے عوامل اور اس کے بارے میں مسلمانوں کے فرائض کی تفصیلات پر مشتمل تھا۔

اپنے مقصد کو پا کر میں اللہ تعالیٰ کے حضور شکر گزار ہوا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے استاد مطہری کی عظمت کا اندازہ بھی ہوا اور دل نے شہادت دی کہ استاد موصوف واقعی مطہر ہیں کہ انہوں نے نہ صرف تحریفات کی آلائشوں سے دین حنیف کی تطہیر کی ہے اور افسانہ سازیوں اور قصہ تراشیوں سے دامن تاریخ صاف کیا ہے بلکہ حقائق کے روشن چہرے سے منفی فلسفہ بازیوں کا رنگ بھی دور کیا ہے۔

میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ ان عظیم الشان اور روشنی بخشیں تقریروں کو ضرور ضبط تحریر میں لاؤں گا۔ اس مقصد کے لئے میں نے قم میں ''نشر روح'' کے مدیر آقای زین الدین سے رابطہ قائم کیا وہ ازراہ کرم اشاعت پر راضی ہو گئے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

میں نے پوری بساط بھر کوشش کی ہے کہ یہ تحریر اغلاط سے پاک رہے لیکن انسان خطا کا پتلا ہے ممکن ہے کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں جن کے لئے میں استاد جلیل کی عظیم روح اور قارئین کرام سے عالی ظرفانہ عفو و درگزر کا طالب ہوں۔

والسلام

حسین حقجو حوزہ علیمہ قم

ص ب ۳۰۷

مجلس ا ل

الحمد للہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین واصلوٰۃ والسلام علی عبداللہ ورسولہ وحبیبہ سیدنا ونبینا ابی القاسم المصطفیٰ محمد وآلہ الطاہرین المعصومین

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ [1]

ان چند شب کی مجالس میں ہمارا موضوع بحث ''واقعات کربلا میں تحریف'' ہوگا۔

ہماری بحث کا محور وہ تحریفات ہوں گی جو عاشورہ کے تاریخی واقعات کی روایت اور نقل روایت میں واقع ہوئیں ہم اپنی بحث کو مندرجہ ذیل چار فصلوں میں بیان کریں گے۔

فصل اول:

تحریف کا مفہوم دنیا میں موجود انواع تحریف واقعہ کربلا میں ان میں سے کن انواع سے کام لیا گیا ہے۔

---

[1] سور مائدہ: ۱۳

فصل دوم:

عوامل تحریف دنیا میں تحریف کی عمومی صورت اس کی علت داعیہ تحریف
تحریف واقعہ کربلا کے عوامل

فصل سوم:

توضیحات در بارہ تحریفات واقعہ کربلا۔

فصل چہارم:

تحریفات عاشوراء اور مسلمان علماء اور عوام کی ذمہ داری

بحث اول:۔ تحریف کیا ہے؟

لفظ تحریف عربی سہ حرفی مادہ ''حرف'' سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کے حقیقی یا لازمی واقعاتی تسلسل کا رخ موڑنا ہے گویا تحریف ایک طرح کا تغیری عمل ہے۔ اگر آپ کسی جملے شعر یا عبارت کو اس طرح بنا کر پیش کریں کہ وہ مفہوم نہ دے جو اس سے مقصود ہے بلکہ ایسا مفہوم دے جو اس سے مقصود نہیں ہے تو ایسے مقام پر کہا جاتا ہے کہ اس عبارت میں تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً آپ کوئی بات یا کوئی لفظ کسی شخص سے کہتے ہیں اور وہ اسے کسی دوسری جگہ بیان کرتا ہے۔ پھر آپ کو کوئی بتاتا ہے کہ فلاں شخص نے آپ کے قول کو فلاں انداز میں بیان کیا ہے اور آپ بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے کہے ہوئے الفاظ سے اس کا بیان مختلف ہے کیونکہ اس نے آپ کے قول سے کچھ مقدار کم کر کے آپ کے مراد و مقصود مفہوم کو حذف کر دیا ہے اور اپنی طرف سے کچھ مقدار اپنے مقصود مفہوم کی اس میں بڑھا دی ہے جس کے نتیجے میں آپ کا بیان مسخ ہو کر کوئی اور ہی صورت اختیار کر گیا ہے تو آپ کہتے ہیں نہ جناب یہ کچھ میں نے نہیں کہا بلکہ ان حضرت نے میرے الفاظ میں تحریف کر دی ہے لفظ تحریف کی میرے خیال میں مزید وضاحت

کی ضرورت نہیں عرف عوام میں اگر کوئی شخص کسی مستند تحریر میں کتر بیونت یا کمی بیشی کرے تو اسے تحریف کا نام دیتے ہیں۔

انواع تحریف

تحریف کی کئی قسمیں ہیں جن میں دو زیادہ اہم ہیں ایک تحریف لفظی ہے اور دوسری معنوی براہ کرم اس نکتے پر خوب توجہ فرمائیں۔

تحریف لفظی

تحریف لفظی وہ تحریف ہے جو کسی چیز کے ظاہر میں کی جاتی ہے جس سے اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ مثلاً کسی نے آپ سے کچھ کہا۔ آپ نے اس میں اس طرح سے تصرف کیا کہ اس کے الفاظ میں کچھ حذف کر دیا یا کچھ نئے الفاظ کا اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا یا اس کے جملوں کی ترتیب کو اس طرح بدلا کہ معنی کچھ کا کچھ ہو گیا۔ تو یہ تحریف جو ظاہر الفاظ میں تصرف کر کے آپ نے کی تحریف لفظی ہے۔

تحریفِ معنوی

تحریف معنوی سے مراد وہ تحریف ہے جس میں الفاظ میں تو کوئی تصرف وتغیر واقع نہ ہو لیکن ان کا معنی اس طرح بیان کیا جائے کہ اپنے اس صاف سیدھے اور حقیقی مفہوم سے ہٹ جائے جو کہنے والے کا مقصود تھا۔ جب آپ کسی شخص کے الفاظ کا معنی اس طریقے سے بیان کریں کہ جب وہ سنے تو کہے کہ میرا مقصود ان الفاظ سے یہ نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر جب آپ کسی بیان کو ایسے معنی پہنائیں جو آپ کے حسب مدعا تو ہوں لیکن کہنے والے کے مقصود سے منحرف یا متصادم ہوں تو آپ کے اس تصرف کو تحریف معنوی کہیں گے۔

قرآن مجید میں لفظ تحریف کو خاص طور پر یہودیوں کے ذکر میں استعمال کیا

گیا ہے جو اس فن کے جغادری استاد ہیں اور آج ہی نہیں بلکہ اپنی تاریخ وجود کے پہلے ہی روز سے اس فن میں بے مثال مہارت کے مالک رہے ہیں ۔معلوم نہیں یہ لوگ کیا چیز ہیں اور کس جنس سے تعلق رکھتے ہیں جس کا واحد فطری میلان اور جس کی تنہا نژادی خصوصیت حقیقت کے رخ زیبا کو بگاڑنا اور داغدار کرنا ہے اسی لئے وہ ایسے ذرائع پر ہمیشہ مسلط رہتے ہیں جن میں حقائق کو حسب خواہش بدل دینے کا زیادہ سے زیادہ امکان اور تحریف کی ہر ممکن گنجائش موجود ہو میں نے دنیا کے معروف خبر نگاروں کی زبانی سنا ہے ۔(اس مقام پر ان کا نام ذکر کرنا ضروری نہیں) کہ دنیا کی بڑی بڑی اخباری ایجنسیاں جن سے عالمی ذرائع ابلاغ ریڈیو اخباری روز نامے ٹی وغیرہ خبریں نقل کرتے ہیں خالصتاً یہودیوں کی ملکیت ہیں ان ذرائع پر انہوں نے صرف اسی مقصد سے تسلط قائم کر رکھا ہے کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں امور دنیا میں ترمیم کر کے اہل دنیا کے سامنے پیش کریں اور عالمی سیاست کا رخ اپنے مردہ عزائم کی تکمیل کی طرف موڑ لیں جو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اقوام عالم ناگزیر طور پر ان کے مصالح کی غلام ہو جائیں اور دنیا کے مادی اور سیاسی وسائل پر ان کی اجارہ داری قائم ہو جائے۔

قرآن مجید نے ان کے بارے میں بڑے عجیب انداز میں ذکر فرمایا ہے اور تحریف کو ان کی نسلی خصوصیت قرار دیا ہے سورۃ بقرہ میں ارشاد باری ہے ''اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا '' مسلمانو کیا تم یہ خواہش رکھتے ہو یہ لوگ تمہارے ساتھ امانت وصداقت سے پیش آئیں یہ وہی تو ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جا کر اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور جب اپنی قوم کی طرف لوٹتے تو فرمودات خداوندی کو الٹ پلٹ کے ان کے سامنے پیش کرتے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ
یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ
یَعْلَمُوْنَ ۝٧٥

کیا تم ان لوگوں سے ایمانداری اور سچائی کی امید رکھتے ہو؟
کیا یہ وہی نہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جا کر اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے
تھے اور اسے کلام خدا ماننے اور سمجھ لینے کے باوجود واپس آ کر
اپنی قوم کے سامنے اسے الٹ پلٹ کے بیان کرتے تھے۔[1]

یہ بھی نہیں کہ تحریف ان سے نادانستگی کی وجہ سے ہو جاتی تھی اور فرمودات الٰہی کو وہ ناسمجھی سے غلط نقل کر دیتے تھے کیونکہ یہ ایک نہایت چالاک اور ہوشیار قوم ہیں ہر بات کو خوب سمجھتے ہیں اور جان بوجھ کر اس میں تحریف کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔تحریف یہی ہے کہ کسی چیز کو توڑ موڑ کر اس کے اصل مفہوم سے اسے دور اور مقصود حقیقی سے اسے منحرف کر دیا جائے۔

یہودیوں نے آسمانی کتابوں میں تحریف کی۔ قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر جہاں تحریف کا لفظ استعمال نہیں کیا اس کے مفہوم کو بیان کر دیا ہے۔لیکن مفسرین کا بیان ہے کہ:

جس تحریف کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اس میں لفظی یا معنوی کی تخصیص نہیں یعنی بعض تحریفات الفاظ میں واقع ہوئی ہیں لیکن لفظی تحریف کی بحث کی تفصیل میں جانے سے اندیشہ ہے کہ موضوع کی حدود قائم نہ رہ سکیں بہرحال تحریف کی دو قسمیں ہوئیں

۱۔تحریف لفظی

۲۔تحریف معنوی۔

اس مقام پر مجھے ایک بات یاد آ گئی بری نہیں نہ ہی موضوع سے خارج ہے لہٰذا پیش خدمت ہے۔

---

[1] سور البقرہ:۷۵

سادہ لوح ذاکر

علمائے کرام میں سے ایک کی جو تہران کے رہنے والے تھے جوانی کے زمانے کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ تہران سے ایک ذاکر مشہد میں آیا ہوا تھا۔ وہ روزانہ مسجد گوہر شاد میں آ کر صحن مسجد میں کھڑا ہو جاتا اور مناقب خوانی کرتا۔ ایک دن وہ مولوی صاحب بھی وہاں موجود تھے اور بیچارے ذاکر کو مزاحیہ نظروں سے گھور رہے تھے ذاکر حافظ شیرازی کی مشہور مدحی غزل پڑھ رہا تھا۔

اے دل غلام شاہ جہاں باش و شاہ باش
پیوستہ در حمایت و لطف الہ باش
قبر امام ہشتم و سلطان دین رضا
ازجاں ببوس و بردر آن بارگاہ باش

اے دل دنیا کے بادشاہ کا غلام بن کر بادشاہ بن جا اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی پناہ اور اس کے فضل کرم کے سائے میں رہ۔ سلطا دین امام ہشتم جناب علی رضا علیہ السلام کی ضریح مبارک کو پوری عقیدت سے چوم اور اس حریم مقدس کے آستاں پر اقامت اختیار کر لے۔

مولوی صاحب نے اسے گھیر لیا باوجود اس کے کہ وہ ان اشعار کو درست پڑھ رہا تھا اسے کہنے لگے: یہ شعر غلط کیوں پڑھ رہے ہو ؟ ذاکر نے کہا: تو پھر صحیح کیسے پڑھوں؟ مولوی صاحب نے کہا دراصل صحیح شعر یوں ہے:

قبرامام ہشتم و سلطان دیں رضا
ازجاں ببوس وبردرآں بار کاہ باش

اس نے حیرانی سے پوچھا:'' بارکاہ کا کیا مطلب ہے؟'' مولوی صاحب بولے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آستان مقدس پر پہنچ کر ایسا مسکین و ذلیل ہو جا گویا

کہ تو گھاس کا وہ گٹھا ہے جسے گدھے کی پیٹھ پر سے اتار کر زمین پر ڈال دیا گیا ہو۔ اس طرح سے تم امام علیہ السلام کی فوری توجہ کے حقدار ہو جاؤ گے۔'' ذاکر کو یہ عجیب معنی پسند آئے اور اس کے بعد وہ جب آتا اس شعر کو ''بار کاہ'' کے لفظ کے ساتھ ادا کر کے خود کو زمین پر گرا دیتا۔

تحریف لفظی کی یہ ایک مثال پیش کی گئی ہے اس سے آپ تحریف کا مفہوم بخوبی سمجھ گئے ہوں گے علاوہ ازیں ایک تحریف معنوی بھی ہوتی ہے نیز یہ بھی یاد رہے کہ تحریف موضوع تحریف سے ایک مختلف چیز ہے۔

بعض اوقات تحریف روزمرہ کی باتوں میں کی جاتی ہے یعنی دو شخص آپس میں معمول کی باتیں کر رہے ہیں تو کسی نے نقل کرتے وقت ان میں تحریف کر دی لیکن بعض اوقات تحریف کسی اہم اجتماعی امر میں کی جاتی ہے جس سے معاشرے کی روش یا سماجی صورت حال متاثر ہوتی ہے مثلاً بڑی شخصیتوں کے اقوال میں تحریف جن کے الفاظ و اعمال لوگوں کے لئے حجت کا درجہ رکھتے ہیں اور جن کا وجود افراد معاشرہ کے لئے نمونے کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی جملے یا عبارت کو علی علیہ السلام سے منسوب کر دے جو آپ نے نہ فرمایا ہو یا آپ کے کسی فرمودہ کا وہ مفہوم بیان کرے جو آپ کے مقصود سے مخالف یا متصادم ہو تو یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی عمل کو امام علیہ السلام یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کر دینا کہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں کتنی بڑی جرأت ہے درآنحالیکہ ان کا حقیقی ذاتی عمل کسی نہایت اہم تاریخی اور اجتماعی واقعے کے دوران جو افراد معاشرہ کے لئے اخلاقی نقطہ نظر سے سند کی حیثیت رکھتا ہو اس سے مختلف رہا ہو۔

وائے ہو اس صورتحال پر کہ تحریفات لفظی ہوں یا معنوی ایسے امور میں کی جائیں جو معمولی اور روزمراتی نہ ہوں۔ بلکہ معاشرے پر قومی تاثیر کے حامل ہوں۔

تحریف نہ صرف حافظ شیرازی ہی کے شعروں میں جائز نہیں بلکہ کسی بھی اہم

تصنیف میں نہیں کرنی چاہئے حتیٰ کہ چوہے بلی کی کہانی میں بھی نہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اساتذہ میں سے کسی نے چوہے بلی کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اسے چوہا بلی ہی کہتے ہیں لیکن استاد موصوف کی کتاب ادبی نقطہ نگاہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یار لوگوں نے چوہے بلی کی کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں پر اتنا ہاتھ صاف کیا ہے اس قدر حذف و اضافہ سے کام لیا ہے اور الفاظ وعبارات میں اتنی تحریف کی ہے جس کی کوئی حد نہیں انہوں نے لکھا تھا کہ میری نظروں میں بات کرنے میں قصہ گوؤں سے زیادہ بے امانت کوئی نہیں کہ انہوں نے تاریخی آثار میں اتنا زیادہ ردوبدل اور بے جا دخل وتصرف کیا ہے کہ توبہ ہی بھلی ایسا بہرحال نہیں ہونا چاہئے۔لیکن ایسی تحریفات نہ معاشرتی زندگی پر اور نہ معاشرتی مسرت وخوش گزارنی پر ہی کوئی منفی اثر مرتب کرتی ہیں اور نہ اجتماعی امور اور سماجی سرگرمیوں میں خلل انداز ہوتی ہیں لیکن ان امور میں جو اخلاق تربیت یا دین سے متعلق ہوتے ہیں تحریف بہت خطرناک ہے شاید میں نے پہلے بھی کبھی کہا ہے کہ مثنوی مولوی رومی میں ایک شعر ہے۔مثنوی میں بھی تحریف نہیں ہونی چاہئے۔لیکن کیا وہ تحریف سے محفوظ رہ سکی ہے؟۔اس میں الحاقی شعر اس قدر زیادہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کو ان کی صحیح تعداد کا علم ہے۔غیر محرف مثنوی کا ایک شعر ہے جس میں محبت کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

از محبت تلخ ہا شیریں شود
و از محبت نطفہ ہا زریں شود

بڑے صحیح اور جچے تلے الفاظ ہیں محبت واقعی ایسی چیز ہے جو تلخی کو شیرینی میں بدل سکتی ہے یہ کیمیا کا اثر رکھتی ہے اور انسان کے وجود کو کندن بنا دیتی ہے۔لیکن بعد میں اضافہ کرنیوالوں نے مجھے پوری طرح یاد نہیں اس طرح کی باتیں کیں کہ محبت سے زہر تریاق بن جاتا ہے محبت چھت کو دیوار بنا دیتی ہے محبت سے خربوزہ تربوز بن جاتا

ہے۔ وغیرہ قسم کی بے سروپاباتیں.....لیکن اس قسم کی تحریف تحریف ہونے کی حد تک اگرچہ معیوب ہے لیکن مضرنہیں افسوسناک صورت تحریف کی وہ ہے جو انسانی امانت و دیانت پر حملہ آور ہو۔ اختصار کی خاطر مقدمات سے صرف نظر کر کے ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

واقعہ کربلا ہم لوگوں کے لئے چارو ناچار ایک بہت بڑا اجتماعی حادثہ ہے جس سے لازماً ہماری تربیت ہمارے اخلاق اور ہماری عادات متاثر ہوتے ہیں یہ ایسا حادثہ ہے کہ ہم کسی بھی طاقت کی طرف سے کسی جبرواکراہ کے بغیر لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں اور لاکھوں گھنٹے اور لاکھوں روپے صرف کر کے اسے اور اس سے متعلق ومربوط حقائق و واقعات سننے کے لئے صرف کرتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ یہ واقعہ جو کچھ بھی ہے اور جس طرح سے بھی وقوع پذیر ہوا بے کم وکاست اور بلا اضافہ وزیادت بیان کیا جائے۔ اگر ہم نے اس کے ذکر میں ذرہ برابر بھی تصرف وتغیر کو راہ دی تو اس کی سچائی متاثر ہوگی۔ یہ حقیقت و واقعیت سے منحرف ہو جائے گا اور نتیجتاً ہم اس سے استفادہ کرنے کی بجائے صریح ضرر سے دو چار ہوں گے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ واقعہ کربلا اور نقل وقائع کربلا میں خود حادثہ کربلا میں جو کسی بھی صورت میں لائق تحریف نہیں ہے ہم نے محض زیب داستان کی خاطر نہ صرف ہزارہا لفظی تحریفات کی ہیں جن سے اس کی حقیقی شکل اس کا اصل قضیہ اس کے مقدمات متن عبارت حواشی عبارت غرضیکہ ہر چیز بدل گئی ہے بلکہ اس واقعے کی شرح وتفسیر کے میدان میں بھی ہمارے سمند تحریف و تصرف نے خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں جس سے اس کی معنویت بھی متاثر ہوئی ہے اور ہمیں بکمال تاسف اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ عظیم واقعہ ہمارے ہاتھوں دونوں ہی قسم کی تحریف۔ لفظی اور معنوی سے بری طرح دوچار ہوا ہے اگرچہ اتفاقاً بعض تحریفات اس کی روح سے ناہم آہنگ نہ سہی لیکن بعض تو اس کے ساتھ نہ صرف یہ کہ ذرہ بھر بھی ہم آہنگی نہیں رکھتیں بلکہ اکثر اوقات اس کی اخلاقی و دینی

اہمیت ومعنویت سے منافی اور اس میں پیش کی گئی عظیم انسانی اقدار اور اعلیٰ روحانی تعلیمات سے متصادم ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ اس سے اس عظیم الشان تاریخی واقعہ کی افادیت مجروح اس کا تقدس مشتبہ اور اس کی مقصدیت مسخ ہو جاتی ہے اور اس کے تاریخ ساز کردار دنیائے دنی کے حریص اور ہوس اقتدار کے مجرم ثابت ہوتے ہیں۔

تحریف لفظی

اب میں ظاہر الفاظ میں واقع ہونے والی تحریف کی چند مثالیں پیش کروں گا۔ واقعہ کربلا میں یہ تحریف اتنی کثرت سے واقع ہوئی ہے کہ اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہمارے ہاں روضہ خوانی ذاکری کا من گھڑت اور خود ساختہ جعلی مواد اتنا زیادہ ہے کہ۔

''سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے''

اس کے مفصل بیان کے لئے ۵۰۰ صفحات کی ضخامت کی کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں لیکن میں بطور نمونہ مشتے از خروارے ذیل کی چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

اس ضمن میں میں نے کتاب ''لولووالمرجان'' سے استفادہ کیا ہے جو مرحوم حاجی شیخ عباس قمی کے استاد میرزا حسین نوری اعلی اللہ مقامہ کی تالیف ہے وہ غیر معمولی طور پر ایک متبحر عالم اور محدث ہونے کے علاوہ بڑے پرجوش مقرر اور مخلص مومن تھے اگرچہ ان کی بعض تالیفات پر علمائے وقت نے اعتراضات وارد کئے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کی کتابیں بہت اچھی ہیں۔ اہل منبر کے بارے میں لکھی گئی یہ ''لولووالمرجان'' اگرچہ حجم میں بہت چھوٹی ہے لیکن افادیت میں کئی ضخیم جلدوں پر بھاری ہے یہ کتاب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔

ا۔ فصل اخلاص یعنی خطیب واعظ یا ذاکر ہونے کی شرط اول خلوص نیت ہے اور جب وہ منبر پر جائے تو اس کا مطمح نظر صرف روپیہ یا کوئی دنیوی مفاد نہ ہو

اس موضوع پر انہوں نے سیر حاصل بحث کی ہے۔

۲۔صدق وراستی۔ اس فصل میں انہوں نے صدق وکذب روایت پر بحث کی ہے اور دروغ بیانی کی جملہ قسمیں بیان کر کے اتنی تفصیل سے ان پر بحث کی ہے کہ کسی بھی کتاب میں آپ کو نہیں ملے گی۔ اس میں آپ کو ان تمام من گھڑت اخبار و روایت کی جملہ انواع و اشکال پر بحث ملے گی جو واقعہ عظیم کربلا سے منسوب کی گئی ہیں۔ میں اس کتاب میں زیادہ تر انہیں بیانات کے حوالے سے بات کروں گا جن پر انہوں نے خود بھی اظہار افسوس کیا ہے وہ عزاداری کے خلاف نہیں بلکہ پورے زور وشور سے اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عزاداری ضرور ہونی چاہئے لیکن عصر حاضر میں عزاداری کی ایک نئی قسم ایجاد ہوئی ہے جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ یہ جدید عزاداری کربلا کے بارے میں قطعاً جھوٹی اور بناوٹی روایات پر مبنی ہے لیکن کوئی شخص اس کی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ حسین علیہ السلام پر ہونے والا یہ ظلم کربلا میں آپ پر تلواروں اور نیزوں سے ہونے والے ظلم سے بڑا ہے دراصل آج کربلا میں ہونے والے مظالم سے زیادہ اس ظلم پر گریہ کی ضرورت ہے۔

کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے ایک عالم نے ایک خط میں مجھ سے شکایت کی کہ ان کے ہاں اہل منبر حضرات واقعات کربلا بیان کرنے میں کذب وافتراء کے مرتکب ہو رہے ہیں لہٰذا آپ براہ کرم اس صورتحال کے سد باب کے لئے ایک کتاب لکھیں۔ میں نے انہیں جواب میں لکھا کہ آپ کا یہ خیال کہ روضہ خواں حضرات یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر جب ہندوستان پہنچتے ہیں تو جھوٹ بولنا اور بے سروپا روایتیں تراشنا شروع کر دیتے ہیں غلط ہے بلکہ وہ یہ سب کچھ یہیں سے سیکھ کر جاتے ہیں اور دراصل جھوٹی مجلس خوانی کا مرکز خود کربلا نجف اور ایران کے مراکز تشیع ہیں۔

میں نمونہ کے طور پر کچھ مثالیں عرض کروں گا جن میں سے بعض عاشورا سے قبل اور بعض کربلا کے سفر کے دوران کے واقعات بعض کربلا میں قیام کے دوران اور زیادہ تر روز عاشورا پیش آنے والے سوانح اور بعض اسیری اہلبیتؑ کے دوران اور بعض سانحہ کربلا کے بعد آئمہ طاہرین کو پیش آنے والے مصائب کے بارے میں ہوں گی۔

میں یہ بات ابتدا ہی میں صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اس سب کچھ کی ذمہ داری صرف اہل منبر حضرات ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اس میں آپ سامعین بھی برابر کے شریک ہیں۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ نہی عن المنکر مومن کا فریضہ ہے جب آپ کو معلوم ہے اور آپ دیکھتے اور خوب سمجھتے بھی ہیں کہ واعظ غلط بیانی کر رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے تو ایسی مجلس میں بیٹھے رہنا حرام ہے بلکہ اس صورتحال کے خلاف ڈٹ جانا ضروری ہے۔

اس کی وجہ وہ میلان بھی ہے جو بانیان مجلس اور سامعین حضرات ایسے روضہ خوانوں کی طرف رکھتے ہیں جن کی مجلس خوب ''لگتی'' ہو۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ مجلس اتنی ''لگے'' کہ بس کربلا ہی بن جائے اب روضہ خواں بے چارہ کیا کرے اگر واقعات پوری صحت سے اور کسی قسم کی رنگ آمیزی کے بغیر بیان کرے۔ تو مجلس ''لگتی'' نہیں اور یہ چیز مستقبل میں اس کی مقبولیت پر منفی اثر بھی ڈال سکتی ہے۔

مزید برآں سامعین کے ذہنوں میں مجلس خواں کی کامیابی کا یہ معیار نہیں ہونا چاہئے کہ وہ بہت رلاتا ہے مجلس کو کربلا بنا دیتا ہے یہ کیا بات ہوئی بھلا کہ کربلا بنا دیتا ہے اور یہ کیا معیار ہے مجلس خوانی کا۔؟ آپ درست واقعات سنیں گے تو آپ کے علم و معرفت کو بھی جلا ملے گی اور آپ کی سطح فکر بھی بلند ہوگی۔ اور اس طرح اگر ایک لفظ سے بھی آپ کے ذہن نے صحیح تاثر لے لیا اور ایک لمحے کے لئے بھی اگر آپ کی روح رو حسین علیہ السلام سے ہم آہنگ ہوگئی اور من گھڑت مصائب سن کر بے تحاشا اور کھو کھلے

اشکوں سے رومال بھگونے کے بجائے صحیح ماجرائے کربلا سن کر نصف آنسو بھی اگر آپ نے خلوص دل سے بہا لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح سے ہم آہنگ ہو کر اگر ذرہ بھر بھی آپ کی آنکھیں غم امام مظلومؑ میں نمناک ہو گئیں تو آپ نے غرائے حسینؑ کے ثواب و سعادت کی انتہاؤں کو چھو لیا اور **لو کنت معکم فافوز فوزاً عظیما** کے مقام پر فائز ہوئے۔

لیکن جھوٹے روضہ خوانوں سے اپنی کھال اتروا کر خواہ آپ آنسوؤں کے دریا بھی بہادیں تو بے سود ہوگا۔تہران کے مضافات کے ایک عالم دین سے منقول ہے کہ علماء میں سے ایک جو تدین میں مشہور تھے ہمیشہ رائج روضہ خوانی پر اعتراض کیا کرتے تھے: ان کا تکیہ کلام ''زہر مار'' تھا اور وہ غلط بیان روضہ خوانوں کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے: تم لوگ منبر پر یہ کیا ''زہر مار'' بکتے پھرتے ہو؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی الفاظ ایک مولوی صاحب سے کہے تو انہوں نے جواب میں کہا: ''اس کے بغیر چارہ نہیں ہے جناب اگر ہم لوگ یہ کام چھوڑ دیں تو ہمیں اپنی دکان بند کر کے خانہ نشینی اختیار کرنی پڑے گی۔ لیکن مولانا اپنے موقف پر قائم رہے اور انہیں اس ''زہر مار افشانی'' پر سرزنش کرتے رہے۔

یہ زہر مار.....؟

آخر ایک دن انہی مولانا نے اپنی مسجد میں عزا منعقد کی اور بحیثیت بانی مجلس انہی روضہ خوان مولویوں میں سے ایک صاحب کو مجلس پڑھنے کے لئے دعوت دی لیکن انہیں تاکید کی کہ صرف معتبر کتب ہی سے واقعات نقل کریں اور کوئی ''زہر مار'' منہ سے نہ نکالیں مطلب وہی تھا کہ غیر مستند اور جھوٹے قصے بیان نہ کریں۔مولوی صاحب نے بسر وچشم اس کی حامی بھر لی۔مولانا صاحب قبلہ رخ رکھے ہوئے منبر کے پاس ہی محراب مسجد میں بیٹھ گئے مولوی صاحب فضائل بیان کرنے کے بعد جب مصائب پر

آئے تو چونکہ راست بیانی کا وعدہ کر چکے تھے لہٰذا صرف مستند تاریخی واقعات بیان کرنے لگے لیکن پورا زورِ خطابت خرچ کر دینے کے باوجود مجلس برف کی طرح ٹھنڈی رہی اور سامعین ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے مولانا صاحب نے جب دیکھا کہ اپنی ہی مجلس غارت ہوئی جا رہی ہے اور خاص طور پر عورتیں تو طعنے دیں گی کہ مولانا کی نیت میں کوئی خرابی تھی جس کی وجہ سے مجلس پھیکی رہی چنانچہ اگرچہ ان کی نیت بدستور صاف اور نیک تھی لیکن خلوص نیت ہی سے یہ بھی ضرور چاہتے ہوں گے کہ مجلس لگے اور اتنی لگے کہ کربلا ہو جائے کیونکہ ان کی آبرو کا سوال تھا..... مولوی صاحب کو کنکھیوں سے دیکھ آہستگی سے بولے ''اس میں تھوڑا سا ''زہر مار'' شامل کرو''

یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے دراصل مجلس کو کربلا بنانے کی یہی خواہش زیب داستان کے لئے جھوٹ اور جعلسازی کی راہ کھولتی ہے اور اسی کی خاطر عمل میں آنے والی بیشتر قصہ تراشیاں مناقب اہل بیتؑ سے مصائب کی طرف گریز کا مقدمہ ہیں۔ بالفاظ دیگر جھوٹے قصے محض اس غرض سے تراشے گئے کہ گریز کے لئے راہ ہموار ہو اور ذکر مصائب چھیڑ کر سامعین کے لئے اشک ریزی کا موقع فراہم کیا جائے۔ قضایا کے مقدمات میں میں نے ان سے بہت کچھ سنا ہے اور حضرت ابو الفضل العباس کی حضرت سید الشہدا ''ع'' کے ساتھ والہانہ محبت اور وابستگی کا یہ اہانت آمیز قصہ: تو سبھی نے سنا ہے ''لکھا ہے کہ ایک روز حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام منبر پر تشریف فرما خطبہ دے رہے تھے دوران خطبہ امام حسینؑ نے فرمایا مجھے پیاس لگی ہے'' پانی منگوا دیجئے جناب امیرؑ نے فرمایا کوئی ہے جو میرے نور نظر کے لئے پانی لائے؟ تو سب سے پہلے جو شخص اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا وہ ایک کمسن نوجوان تھا یہ حضرت ابو الفضل عباس تھے جو اپنی والدہ محترمہ کے پاس گئے'' پھر ان سے پانی کا ایک کٹورا لینے کی کیفیت بڑی تفصیل سے بیان کی ہے'' اور جب واپس آئے تو سر پر پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی تھی جس میں سے پانی باہر چھلک رہا تھا یہ منظر دیکھ کر جناب امیرؑ کی آنکھوں سے آنسو

جاری ہوگئے حاضرین مجلس نے عرض کیا کہ مولا اس گریہ کا سبب کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا''ایک بات یاد آ گئی تھی'' خدا جانے ان کا معاملہ کہاں پہنچے گا؟''

حاجی نوری نے یہاں بڑی خوبصورت بحث کی ہے وہ کہتے ہیں:''جناب آپ نے فرمایا ہے کہ جناب امیر منبر پر خطبہ فرما رہے تھے لیکن زمانے کا تو کوئی لحاظ رکھیے یہ بہرحال آپ کی خلافت کے زمانے (۳۶۔۴۱ ہجری) کا واقعہ ہوسکتا ہے جب آپ کوفہ میں تھے اب حساب لگایئے کہ امام حسین علیہ السلام کی عمر اس وقت کیا ہوگی اور حضرت عباس کس سن میں ہوں گے؟ امام حسینؑ کی ولادت ۴ ہجری میں ہوئی جب کہ حضرت عباسؑ ۲۶ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اب اگر یہ واقعہ وسط خلافت امیر علیہ السلام کا بھی مان لیا جائے تو جناب سید الشہدا کی عمر ۳۳ سال اور جناب عباس کی عمر ۱۳ سال بنتی ہے تو جناب اب ذرا اپنے بیان کی معقولیت ملاحظہ فرمایئے کہ ایک ۳۳۔۳۴ سالہ معصوم اپنے والد محترم کے خطبے کے دوران دخل انداز ہوکر اپنی تشنگی کا اظہار کرتا ہے اور پانی کی فرمائش کرتا ہے اگر کوئی عام انسان بھی ایسی حرکت کرے تو آپ اسے بے ادب بےتمیز غیر مہذب وغیرہ معلوم نہیں کیا کیا قرار دیں گے۔ ادھر جناب ابوالفضل بھی بچہ نہیں ہیں بلکہ ۱۳۔۱۴ سالہ نوجوان ہیں اب ذرا غور فرمایئے کہ کیا یہ واقعہ صحت کی شرائط پر پورا اترتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک من گھڑت کہانی ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اب اس کے جھوٹا ہونے سے قطع نظر کر کے یہ سوچیئے کہ کیا اس سے سید الشہداء کے علوشان کا پہلو نکلتا ہے یا صریحاً کسر شان اور توہین کا؟ ظاہر ہے کہ یہ داستان آپ کی منزلت کو گھٹاتی اور آپ کی شان کو کم کرتی ہے تو کیا فائدہ ہوا جھوٹ بھی بولا تو کس پر؟ افسوس کہ آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس سے امام علیہ السلام کی آبرو مجروح ہوتی ہے اور وہ (خاکم بدھن) ایک بے ادب ترین انسان ثابت ہوتے ہیں جو علیؑ جیسے عظیم والد کے خطبہ جلیلہ کے عین وسط میں دخل انداز ہوتے ہیں اور اپنی پیاس کا اعلان کر کے پانی کا آرڈر داغ دیتے ہیں اور امام الصابرین ہوتے ہوئے اتنا بھی نہیں

کر سکتے کہ خطبے کے اختتام ہی کا انتظار کر لیں بلکہ امام وقت کی بات کاٹ کر ایک ایسی گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں جو کسی بے تربیت ترین انسان سے بھی متوقع نہیں۔

جھوٹے ٹھاٹھ

کوفہ سے ایک قاصد حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام خط لے کر آتا ہے دیکھیے کس طرح ان لوگوں نے اس کی باریابی کا ''آنکھوں دیکھا حال'' بیان کر کے الفقر فخری کے امتیاز کے حامل ہل اتی کے تاجدار گھرانے کو تراث نبوت سے محروم اور بے بہرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے فرماتے ہیں'' قاصد نے خدمت میں حاضر ہو کر خط پیش کیا اور اس کا جواب چاہا۔ آپ نے فرمایا'' تین روز کے بعد جواب لے جانا۔'' جب وہ تین دن کے بعد آیا تو معلوم ہوا کہ آپ سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ اس نے دل میں کہا کہ دیکھنا چاہئے کہ شاہ حجاز کس شان و شوکت سے روانہ ہوتے ہیں چنانچہ آستانہ نبوت ﷺ پر پہنچا اور دیکھا کہ امامؑ ایک بیش قیمت کرسی پر جلوہ گر ہیں تھوڑی دیر کے بعد محملیں لائی گئیں۔ کیا محملیں تھیں کہ کوئی اطلس کی تھی تو کوئی کم خواب کی اور کوئی حریر کی تھی تو کوئی دیبا کی....اس کے بعد مخدرات عصمت وطہارت تشریف لائیں جنہیں عزت واحترام کے ساتھ محملوں میں سوار کیا گیا(یہاں زور بیان دکھا کر آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں) مدینے سے تو شہنشاہانہ شان وشکوہ سے رخصت ہوئے تھے لیکن آپ کو کیا معلوم کہ روز عاشورا غریب الوطنی میں ان پر کیا گزری۔!''

حاجی نوری فرماتے ہیں'' جناب تاریخی حقائق کا تو منہ نہ چڑایئے آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ کو علم نہیں کہ جب امام علیہ السلام مدینہ منورہ سے نکل رہے تھے تو یہ آیہ کریمہ آپ کی زبان مبارک سے جاری تھی

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ.قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ

الظّٰلِمِیۡنَ [1]

پس آپؑ مدینہ سے بیم ورجا کی حالت میں نکل کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ ظالموں کے شر سے آپ کو نجات دے۔ یعنی خود سید الشہداء نے وطن سے اپنے نکلنے کے عمل کو جناب موسیٰ علیہ السلام بن عمران کے سفر سے تشبیہ دی ہے جب وہ فرعون سے فرار کرنا چاہتے تھے ''قَالَ عَسٰی رَبِّیۡۤ اَنۡ یَّهۡدِیَنِیۡ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ [2] اور پر امید تھے کہ اللہ تعالیٰ منزل مقصود کی طرف ان کی رہنمائی فرمائے گا یہ ایک انتہائی سادہ قافلہ تھا لیکن کیا کیا جائے کہ ان کی نظروں میں اباعبداللہ الحسین علیہ السلام کی عظمت صرف اسی میں ہے کہ طلائی کرسی پر جلوہ افروز ہوں مخدرات عصمت زربفت واطلس وکمخواب کی محملوں میں سوار ہوں۔ ان کے گھوڑے ایسے ہوں ان کے اونٹ ویسے ہوں ان کے نوکر درباری لباس میں ہوں ناطقہ سربہ گریبان ہے اسے کیا کہیے۔ ایسے روایات ایک دو نہیں بیسیوں ہیں۔ اب کربلا سے منسوب چند واقعات کا ذکر کرتا ہوں:

غیر حاضر موجود

ایک نہایت مشہور لیکن تاریخ کے نزدیک قطعاً غیر معروف داستان مادر علی اکبرؑ جناب لیلاء کی ہے اگرچہ آپؑ کی ایک والدہ محترمہ کا نام لیلا تھا لیکن کسی بھی مورخ نے کربلا میں ان کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ہم نے کتنے اور کیسے کیسے مصائب جناب لیلا اور جناب علی اکبرؑ کے مجلس خوانی کے لئے گھڑ رکھے ہیں حتیٰ کہ خود قم میں آیت اللہ بروجردی کی ایک مجلس میں البتہ وہ خود اس میں موجود نہ تھے میں نے جناب لیلاء کے وقت نزع علی اکبر علیہ السلام کے سرہانے تشریف لانے کی یہ رقت انگیز روایت سنی ہے۔

---

[1] سور القصص:۲۱

[2] سور القصص:۲۲

علی اکبر علیہ السلام میدان میں

جب جناب علی اکبرؑ میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے تو سید الشہداء نے ام لیلاء سے فرمایا: ''میں نے سنا ہے کہ ماں کی دعا بیٹے کے حق میں مستجاب ہوتی ہے آپ خلوت میں جائیں اور سر کے بال بکھیر کر اللہ تعالیٰ سے اپنے بیٹے کے لئے دعا کریں۔ شاید وہ ذات اقدس ہمارے بیٹے کو بخیر وعافیت واپس لے آئے......جی حضرات کربلا میں کوئی لیلاء موجود نہ تھیں جناب یہ الفاظ سید الشہداء کے نہیں ہیں روز عاشور آپ کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ جانبازی کی تعلیم اور شہادت فی سبیل اللہ کی تلقین کا حامل تھا اور سب مؤرخین نے لکھا ہے کہ ہر شخص جس نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے جنگ کی اجازت چاہی آپ نے کوئی عذر پیش فرمایا لیکن حضرت علی اکبرؑ نے ''فاستأذن أباه'' اپنے والد ماجد سے اجازت طلب کی تو ''فاذن له'' آپ نے بلا عذر اجازت دے دی۔

اب یہ شعر ملاحظہ فرمایئے

خیز اے بابا ازیں صحراء رویم
اینک بہ سوی خیمۂ لیلیٰ رویم
آیئے اس دشت سے بابا چلیں
اٹھ کے سوئے خیمۂ لیلیٰ چلیں

مگر جناب! لیلیٰ وہاں کہاں تھیں؟

اس وقت نہایت بروقت ایک چیز مجھے یاد آئی جو حیرت انگیزی میں اپنی نظیر نہیں رکھتی یہیں تہران میں چند سال ہوئے شہر کے ایک بڑے عالم کے گھر ایک مجلس میں ایک مولوی صاحب نے جناب لیلا کے مصائب کے بیان میں ایک ایسی بات کہی جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنی تھی:

جناب لیلیٰ کی عجیب وغریب نذر

مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب حسب ارشاد امام علیہ السلام جناب لیلا نے خلوت میں اپنے بال کھولے تو نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ علی اکبرؑ کو میدان جنگ سے صحیح و سلامت لوٹا دے تو میں کربلا سے مدینے تک پورے نو سو میل کے راستے میں ریحان و خوشبودار پھول اگاؤں گی اور ساتھ ہی مولوی صاحب نے دبی زبان میں ایک شعر بھی داغ دیا۔

نذر علی ان هأداوان رجعوا
لازرعن طريق التف ريحاناً

میں نذر مانتی ہوں کہ اگر یہ لوگ واپس آ گئے تو توتف کے سارے راستے میں ریحان اگاؤں گی اب تو حیرت وتعجب سے میرا ذہن مختل ہو گیا کہ یہ عربی شعر کہاں سے آ گیا؟ مجھ پر اس کی کرید سوار ہو گئی اور کافی کوشش کے بعد آخر میں نے اس عقدے کو حل لیا: دراصل تف سے مراد اس شعر میں سرزمین کربلا نہیں ہے بلکہ یہ تف وہ سرزمین ہے جس میں لیلا مجنوں کی مشہور داستان کے ہیرو اور لیلا نامی ایک عورت کے عاشق ''قیس عامری'' کی سکونت تھی یہ شعر قیس عامری کا ہے جو اس نے اپنی محبوبہ لیلا کے قبیلے کے بارے میں کہا تھا لیکن جسے اس بددیانت روضہ خواں نے لیلا مادر علی اکبرؑ سے منسوب کر دیا۔ اب آپ غور فرمائیں کہ اگر کوئی صاحب علم عیسائی یا یہودی یا کوئی لامذہب آدمی اس مجلس میں موجود ہوتا تو چلیے نہ ہی جانتا سہی کہ یہ شعر قیس عامری کا ہے اور یہ بھی نہ سمجھتا کہ اسے مولوی صاحب نے خود نظم کیا ہے تو کم از کم ہماری تاریخ کے بارے میں کیا رائے قائم کرتا؟ کیا وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب نہ ہوتا کہ یہ واہیات وخرافات سے بھری ہوئی ہے اور کہ خاندان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہو بیٹیاں اتنی بے شعور اور جاہل اور گنوار تھیں (معاذ اللہ) کہ کربلا سے مدینہ تک ریحان اگانا ایک قابل عمل کام سمجھتی تھیں۔

واثر گوں ہے شرم سے سر خامہء تحریر کا

محاذ جنگ میں عروسی

روز عاشوراء کی اس افراتفری میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نماز تک کی ادائیگی کی فرصت نہ تھی جس کی وجہ سے امام مظلومؑ کو نماز خوف ادا کرنا پڑی اور وہ بھی دو صحابیوں کی اوٹ میں آپؑ انجام دے سکے جو دشمن کے تیروں کے سامنے اسی غرض سے سینہ سپر ہو گئے تھے اور نماز فریضہ کے اختتام تک قصر کر کے صرف دو رکعت اور وہ بھی جلدی میں پڑھی گئی وہ دونوں تیروں کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین پر گر چکے تھے۔تو دیکھا آپ نے کہ اشقیاء نے امام مظلوم علیہ السلام کو نماز تک کی مہلت نہ دی لیکن عین اس صورتحال میں امام فرماتے ہیں سہاگ سیج تیار کرو میرا ارادہ ہے کہ قاسم کی تزویج اپنی ایک بیٹی سے اپنے جیتے جی کر کے اپنی آنکھوں کی حسرت پوری کروں اب قاسم کی عمر اگرچہ صرف تیرہ سال ہے لیکن امام تزویج پر مصر ہیں اور نہیں چاہتے کہ اپنی آرزو کو اپنے ساتھ قبر میں لے جائیں۔

اب خدارا غور فرمائیں کہ جو الفاظ ایک گنوار دیہاتی عورت کی زبان بھی کہنے سے ہچکچائے اور پست ترین ذہنیت کے انسان کو بھی ان کی ادائیگی میں تکلف محسوس ہو وہی الفاظ ہمارے روضہ تراش حضرت امامؑ ابن امامؑ کی زبان سے کتنے جذباتی انداز میں نکلوا رہے ہیں اور وہ بھی جنگ کی اس رستاخیز کے عالم میں جہاں نماز کی بھی فرصت نہیں۔

ہماری قدیم تعزیہ خوانی میں عروسی قاسم مجالس کا جزولاینفک رہی ہے حالانکہ کسی بھی معتبر تاریخی حوالے سے یہ چیز قطعاً ثابت نہیں ہے اور نہ اس کا کہیں ذکر موجود ہے۔

حاجی نوری فرماتے ہیں کہ عروسی کے اس قصے کا موجد ''ملا حسین کاشفی'' ہے اور سب سے پہلے اسی نے اسے تراش کر اپنی کتاب روضۃ الشہداء میں لکھا۔ اور ظاہر ہے کہ کسی جھوٹے بیان کے مآخذ ومصادر بھی سو فیصدی جھوٹے ہی ہوں گے۔

اگر آج سید الشہداء تشریف لے آئیں اور ہمارے ان افعال و اعمال کو دیکھیں۔ عالم معنی میں تو وہ مشاہدہ فرما ہی رہے ہیں لیکن اگر عالم ظاہر میں آ کر دیکھیں تو کیا کہیں گے؟ ہم نے تو ان کے کئی ایسے اصحاب بھی خلق کر ڈالے ہیں جن کا کبھی کوئی وجود نہ تھا میری نظروں سے ایک کتاب گزری ہے جس کے مصنف اتفاق سے ایک بڑے عالم اور فقہیہ ہیں لیکن بدقسمتی سے تاریخ پر پوری اطلاع نہیں رکھتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ روز عاشورا عدم سے اچانک وجود میں آنے والے اصحاب حسین علیہ السلام میں ایک ہاشم مرقال تھے جن کے ہاتھ میں ۱۷ ہاتھ لمبا نیزہ تھا ۱۷ ہاتھ لمبا نیزہ؟ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سنان بن انس کے پاس جس نے عام روایت کے مطابق سید الشہدا کا سر مبارک جسم سے جدا کیا تھا ۶۰ ہاتھ لمبا نیزہ تھا اور جب ان سے کسی نے کہا کہ بھائی نیزہ تو ۶۰ ہاتھ لمبا نہیں ہوسکتا تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ بہشت سے اس کے لئے بھیجا تھا (خندہ حاضرین) ہاں تو اس کتاب میں لکھا ہے کہ ہاشم بن مرقال ۱۷ ہاتھ لمبا نیزہ ہاتھ میں لئے امام مظلومؑ کی مدد کے لئے عدم سے وجود میں آئے حالانکہ ہاشم مرقال اصحاب امیر المومنین علیہ السلام میں سے تھے جو واقعہ کربلا سے بیس سال پہلے شہید ہو چکے تھے۔

امام حسین علیہ السلام کے ان یاران وانصار میں سے جن کا کبھی کوئی وجود نہ تھا ایک جعفر جنّی ہے امام علیہ السلام کہتے رہیں کہ میرا کوئی حامی و ناصر اس نام کا نہ تھا لیکن ہم کیوں مانیں۔ کیونکہ ہمارے خیال میں تو جعفر جنی کے وجود سے انکار کی ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ کتاب اسرار الشہادت میں لکھا ہے کہ کربلا میں عمر سعد کے سولہ لاکھ (۱۶۰۰۰۰۰) لشکری تھے یہ اتنی بڑی فوج کہاں سے آ گئی؟ کہتے ہیں کہ یہ سب کوفہ کے باشندے تھے لیکن یہ کیسے ممکن ہے ہمیں معلوم نہیں۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے روز عاشورا تین لاکھ افراد اپنے ہاتھوں سے قتل کئے۔ بھئی ہوش کے ناخن لو ہیروشیما پر گرے ہوئے ایٹم بم سے بھی

ساٹھ ہزار سے زائد آدمی لقمہ اجل نہیں بنے تھے! میں نے ایک دن حساب کیا کہ اگر ایک تلوار ایک گردن فی سکینڈ کے حساب سے چلے اور متواتر و مسلسل بلا توقف چلتی رہے تو تین لاکھ گردنیں کاٹنے کے لئے اسے ۸۳ گھنٹے ۲۰ منٹ درکار ہوں گے جب افسانہ تراشوں کے سامنے یہ حساب پیش کیا گیا تو کہنے لگے ٹھیک ہے عاشورا کا دن ۷۰ گھنٹے ہی کا تو تھا۔اسی طرح جناب ابو الفضل عباس نے پچیس ہزار افراد قتل کئے میں نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس قتل عام کے لئے بھی مذکورہ رفتار سے تقریباً سات گھنٹے چاہئیں۔

اب تو آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ حاجی نوری نے ٹھیک ہی فرمایا تھا کہ آج اگر کوئی مصائب امام مظلوم بیان کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ ان کے ان جدید مصائب کا ذکر کرے اور اس ظلم پر آنسو بہائے جو غلط اور جھوٹی روایات آپؑ سے منسوب کر کے خود آپؑ کے منبر سے آپؑ پر ہو رہا ہے کیونکہ یہ کربلا میں آپؑ پر ہونے والے یزیدی مظالم سے کہیں بڑا ہے۔

اور یہ کیا ہے؟

اربعین (چہلم) آتا ہے سب لوگ روضہ خوانی کرتے ہیں اور مجالس میں سنتے ہیں کہ اسیران اہل بیتؑ واپس آ گئے شام سے واپسی پر کربلا پہنچے اور وہاں انہوں نے جابر بن عبداللہ صحابی رسول سے ملاقات فرمائی۔ امام سجادؑ بھی جابر سے ملے جب کہ صورت یہ ہے کہ سید نے اپنی کتاب ''لہوف''میں اگر چہ اس کا ذکر کیا ہے لیکن اپنی دوسری تصانیف میں یا اس کی تکذیب کی ہے یا کم از کم تائید نہیں کی۔علاوہ بریں نہ کسی اور کتاب میں اس کا ذکر ہے اور نہ ہی عقل اسے باور کرتی ہے لیکن لوگوں کو کیسے سمجھایا جائے جن کا عقیدہ ہے کہ اربعین کے دن زیارت امام حسینؑ اس لئے سنت قرار دی گئی ہے کہ اس دن جابر نے آپؑ کی زیارت کی تھی۔

''اربعین''محض زیارت امام حسین علیہ السلام کا دن ہے یہ نہ عزائے اہل بیتؑ

اظہار کی تجدید کا دن ہے اور نہ کربلا میں ان کی واپسی کا کیونکہ شام کی راہ میں کربلا کوئی منزل نہیں اور مدینہ کا راستہ شام ہی سے نکلتا ہے اگر وقت ملا تو کچھ مثالیں بیان کروں گا اب تحریف لفظی کا بیان مختصر کر کے تحریف معنوی کا ذکر کرتا ہوں۔

تحریف معنوی کی اہمیت

انسان کے قلب و ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرنیوالی ایک بڑی حقیقت یہ ہے کہ بہت کم تاریخی واقعات ایسے ہیں جو صحت وثقاہت اور تواتر روایت کے اعتبار سے حادثہ کربلا جتنے مسلم و مستند ہیں۔

پہلے میرا خیال تھا کہ ان تحریفات کی وجہ غالباً یہ ہے کہ حقائق و واقعات کربلا کسی کو معلوم نہیں لیکن جب میں نے تفصیلی مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسا معتبر اور مستند واقعہ تو کوئی ہے ہی نہیں پہلی دو صدیوں کے مسلمان مورخوں نے اس کے واقعات کو با قاعدہ معتبر اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے اور اگرچہ ان میں سے بعض اسناد کے مصادر مختلف بھی ہیں تاہم نقل واقعات میں کافی مطابقت موجود ہے حتیٰ کہ عبارات کے متن تک باہم بہت قریب ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ واقعات کی جزئیات پر بھی کافی توجہ دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور نہ صرف اس کا متن محفوظ ہے بلکہ اس کے اہداف و مقاصد بھی مکمل طور پر واضح اور روشن ہیں جس کی ایک بڑی وجہ وہ خطبات ہیں جو بکثرت دیئے گئے ہیں اس زمانے میں خطبے کی حیثیت آج کے اعلامیے یا سرکاری پریس نوٹ کی تھی جو واقعات معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے جس سے تاریخ کا متن مرتب ہوتا ہے۔

یہ خطبے جو کربلا سے پہلے ''کربلا کے دوران'' کربلا کے بعد اہلبیت کی اسیری اور اذیتناک سفر کے دوران اثنائے راہ اور کوفہ و شام کے بازاروں میں اور

درباروں میں دیئے گئے کربلا کے دوران واقعات کی چگونگی اور تفصیلی کیفیت اور ان کے اسباب واہداف پر بڑی روشنی ڈالتے ہیں اور کربلا کے نقل واقعات کے قوی محرکات میں سے ہیں۔

واقعہ کربلا کے دوران سوال و جواب بہت ہوئے ہیں اور متن تاریخ میں محفوظ یہ سوالات و جوابات اور استفسارات بھی اس واقعہ کی حقیقت و ماہیت جاننے کا بڑا ذریعہ ہیں پھر کربلا میں رجز خوانی بہت ہوئی جس سے اس واقعہ کی حقیقت سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔خصوصاً رجزہائے امام حسینؑ تو اس واقعہ کے علل واسباب عوامل ومحرکات بتانے کے علاوہ خود آپ کی ذات اور شخصیت کا بھی مکمل تعارف پیش کرتے ہیں۔

کربلا کے حوالے سے خط کتابت بھی بہت ہوئی جو ساری کی ساری پوری تفصیل سے تاریخ میں محفوظ ہے امام علیہ السلام اور اہل کوفہ اور اہل بصرہ کے درمیان ہونیوالی خط و کتابت اس واقعہ پر بہت اہم زاویوں سے روشنی ڈالتی ہے بالخصوص ان خطوط میں جو آپ نے معاویہ کو لکھے معاویہ کے بعد یزیدیت کے خلاف آپ کے قیام کی تیاری کی واضح جھلک موجود ہے علاوہ ازیں دشمنوں کی باہمی خط و کتابت یزید کے ابن زیاد اور عمر سعد کے نام خطوط عمر سعد کی طرف سے ابن زیاد کو لکھے گئے خطوط۔ سب کا متن تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کربلا اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ تاریخ انسانیت میں روشن ودرخشندہ ہے اور بنی نوع انسان کے لئے عظمت کردار کی وہ تابندہ مثال ہے جو انسانیت کے لئے ابدی سرمایہ افتخار ہے لیکن ہم نے مجرمانہ خیانت کاریوں سے اس کے تابناک چہرے کو مسخ کرنے کی ہر شعوری کوشش کی ہے جس کی وجہ سے یہ اتنا بدل چکا ہے۔ کہ اب پہچانا بھی نہیں جاتا۔حتیٰ کہ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام خود بھی آ کر دیکھیں تو اسے کربلا ماننے سے انکار کر دیں گے اور فرما دیں گے: ''یہ وہ کچھ تو نہیں جو میں نے تمہاری تاریخ کو دیا تھا تم نے اس کے خدوخال ہی بدل ڈالے ہیں جو امام حسینؑ تم نے تراش رکھا ہے وہ میں نہیں ہوں جو

تصویر تم نے قاسم بن حسنؑ کی بنائی ہے وہ میرے برادر زادے کی نہیں وہ علی اکبر جو تمہارے تخیل میں مجسم ہے میرا عارف باللہ نور نظر نہیں۔ جو حلیہ تم میرے انصار و یاران کا پیش کرتے ہو وہ بھی ان کا نہیں''۔ ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ کیا واقعی ہم نے قاسم بن حسنؑ کو ایک ایسا نوجوان نہیں بنا رکھا کہ جس کی تمنا فقط یہ تھی کہ وہ داماد بن جائے اور جس کے چچا کی بھی یہ آرزو تھی کہ اسے داماد بنا لیں۔ کیا ہم اس قاسم کو کسی بھی صورت کربلا والا قاسم کہہ سکتے ہیں؟

سب معتبر تاریخوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ شب عاشور امام مظلوم علیہ السلام نے اپنے سب اصحاب کو ایک خیمہ میں جو پانی ذخیرہ کرنے کے لئے مخصوص ہونے کی وجہ سے ابتدا ہی سے مشکیزہ گاہ قرار دیا گیا تھا یا اس کے نزدیک جمع کیا اور شب عاشور کا مشہور و معروف خطبہ ارشاد فرمایا۔اس وقت میں پورا خطبہ بیان نہیں کروں گا صرف خلاصے پر اکتفا کرتا ہوں کہ آپ نے سب پر سے اپنی بیعت اٹھا لی۔ اتمام حجت کے طور پر فرمایا کہ آپ لوگ آزاد ہیں آپ نہیں چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی شخص کسی مجبوری یا رواداری کی وجہ سے اپنے آپ کو موت کے خطرے سے دوچار کرے یا بیعت ہی کی وجہ سے خود کو موجود رہنے پر مجبور سمجھے۔لہٰذا آپ نے مطلقاً سب کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد کر دیا اور فرمایا۔میرے اصحاب میرے اہل خاندان میرے بھائی میرے بیٹے اور بھتیجے سب اپنی جان بچا لیں اور اس قتل گاہ سے چلے جائیں۔ کیونکہ دشمن صرف میری جان کے درپے ہے اور کسی بھی دوسرے شخص سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ چراغ میں بجھا دیتا ہوں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر یقینی موت سے خود کو بچا لیں اور میرے اہل بیت میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر یہاں سے دور چلے جائیں۔ آپ سب عظیم لوگ ہیں میں آپ سے کلیتاً راضی ہوں۔ میرے اصحاب باوفا جیسے کسی کے اصحاب نہیں نہ میرے اہل بیت سے بہتر کسی کے اہل بیت ہیں آپ بلا کسی جھجک یا رواداری کے احساس کے آزادانہ یہاں سے جا سکتے ہیں۔لیکن

سب نے یک زبان ہوکر جواب دیا۔مولا یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم نبی علیہ السلام کو روز محشر کیا جواب دیں گے۔آخر ہماری وفا کیا ہوئی؟ ہماری محبت کدھر گئی؟ انسانیت کہاں چلی گئی؟ انسانی جذبات کیا ہوئے؟ وفور جذبات میں ایسے ایسے الفاظ انہوں نے کہے جن سے پتھر کا کلیجہ بھی پگھل جائے۔ایک نے کہا مولا! کیا آپ کے ان کلمات کی قیمت صرف ایک ہی جان ہے؟ اے کاش ۷۰ بار زندگی پا کر آپ پر قربان کر دوں۔کوئی کہتا ہے: میری ہزار جانیں آپ پر قربان ہوں۔اور کوئی اپنی تمنا کا اظہار یوں کرتا ہے: اے کاش میرے بس میں ہوتا تو اپنی جان آپ پر قربان کرتا۔پھر میری لاش کر جلا کر اس کی خاکستر کو ہوا میں بکھیر دیا جاتا اور اس سے پھر مجھے زندہ کر دیا جاتا کہ آپ پر دوبارہ اپنی جان نچھاور کروں اور اسی طرح بار بار ہوسکتا۔

سب سے پہلے جس نے اس قسم کا جواب دیا جناب ابوالفضل العباس اور بنی عبدالمطلب تھے۔اعزاؤ انصار کے یہ جذبات سن کر سید الشہداؑ نے موضوع کلام بدلا اور فرمانے لگے تو پھر سن لو کہ کل ہماری زندگی کا آخری دن ہے۔میں آپ سب کو شہادت فی سبیل اللہ کی عظیم بشارت دیتا ہوں۔آپ سب کو خدا کی راہ جان دنیا مبارک ہو۔جنت الفردوس کا سفر مبارک ہو۔

عاشقِ خدا

ایسے وقت میں ایک ۱۳ سالہ بچہ جس پر ہمارے ظلم وستم کا یہ عالم ہے کہ ہم نے اس کی عظمت وفضیلت کو اس کی آرزوئے دامادی میں ڈبو دیا ہوا ہے لیکن زبان تاریخ اس کی عظمت کو یوں بیان کرتی ہے کہ وہ خود کو مردوں کی صف میں بیٹھنے کے ناقابل سمجھتے ہوئے سب سے پیچھے بیٹھا ہوا ہے اور نیم استادہ حالت میں جلسے کی کارروائی دیکھ رہا ہے جب امام علیہ السلام نے فرمایا کہ کل تم سب شہید ہو جاؤ گے تو اس نے اپنے دل سے پوچھا کیا میں بھی ان میں شامل ہوسکوں گا؟ پھر سوچا مولا کا روئے سخن بڑوں کی طرف تھا شاید یہ خوشخبری ان ہی کے لئے ہو۔ میں بچہ

ہوں میرے لئے نہ ہو۔ تو بے قرار ہو کر امام علیہ السلام سے پوچھتا ہے چچا جان! **وانا فیھم من یقتل** کیا میرا نام بھی شہدائے راہ خدا کی فہرست میں ہے؟

دیکھا آپ نے کہ ہمارے معیار فضیلت اور اس بچے کے معیار آرزو میں کتنا ناقابل پیمائش فرق ہے؟ بہرحال امام علیہ السلام جواب میں کچھ توقف کے بعد فرماتے ہیں! پہلے میرے سوال کا جواب دو پھر میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ امام علیہ السلام کا مقصد اس سوال و جواب سے یہ تھا کہ اس کمسن نوجوان کے جواب سے سب کو معلوم ہوجائے کہ اس کی دلی آرزو دامادی نہ تھی بہرحال امام علیہ السلام نے شہزادے سے سوال فرمایا **کیف الموت عندك** موت کا مزا تمہارے نزدیک کیا ہے؟ بلاتوقف وتر دو جواباً عرض کیا! مولا **احلی من العسل** شہید سے بھی زیادہ شیریں ہے میری دلی آرزو ہے کہ آپ کی رکاب میں قتل ہو جاؤں اور اپنی جان آپ پر فدا کر دوں۔ آپ نے جو ذائقے کے بارے میں پوچھا ہے تو آرزوئے شہادت سے شیریں تر آرزو میرے نزدیک کوئی نہیں۔

ملاحظہ فرمائیے کتنا پر تاثیر منظر ہے۔ یہ ہیں اس سانحہ ھائلہ کی خصوصیات خاصہ جنہوں نے اسے عظیم ترین تاریخی حادثہ بنا دیا ہے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اسے زندہ جاوید رکھیں کیونکہ اب نہ کوئی حسین علیہ السلام پیدا ہوگا اور نہ کوئی قاسم یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال کے بعد بھی جب ہم ان کے نام پر عظیم الشان امام بارگاہ تعمیر کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یاد کا حق ادا نہیں ہوا۔ ورنہ اگر صرف دامادی کی آرزو ہی فضیلت کا معیار ہوتی تو ایسا کون نوجوان ہے جسے دامادی کی آرزو نہیں لیکن نہ ہم کسی کی یاد مناتے ہیں نہ یادگار تعمیر کرتے ہیں اور نہ وقت اور روپیہ ہی خرچ کرتے ہیں لیکن یہ ذوات قدسیہ عام انسانوں سے بہت مختلف اور ان سے بہت بلند ہیں یہ لوگ انسانیت کا جوہر اور **إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً**[1] کے مصداق ہیں اور یہی فرشتوں سے بھی

---

[1] سور البقرہ:۳۰

اعلیٰ تر مقام پر فائز ہیں۔

تو امام حسین علیہ السلام نے فرمایا اے جان غم تم ضرور شہادت پاؤ گے۔لیکن اس کی کیفیت دوسروں سے مختلف ہوگی اور بعد ان تبلو ببلا عظیم بہت کٹھن امتحان سے تمہیں گزرنا ہوگا۔

اب جب کہ مجلس کا سماں پیدا ہوگیا ہے اس مصیبت کا ذکر کرتا ہوں شہزادہ قاسم اصرار کے بعد جب جنگ گاہ کی طرف چلے تو نہ ان کے چہرے پر کسی خوف کی پرچھائیں تھیں اور نہ حزن وتذبذب کا کوئی سایہ لیکن جسم نازنین اتنا چھوٹا تھا کہ نہ اس پر کوئی زرہ پوری آتی تھی نہ خود اور نہ ہی ان کے قدوقامت کے مطابق کوئی اسلحہ ہی موجود تھا۔اس لئے مورخین نے لکھا ہے کہ رخصت کے وقت صرف عمامہ ان کے فرق مبارک پر تھا۔قاسم بن حسین علیہ السلام حسن وزیبائی میں چاند کا ٹکڑا نظر آتے تھے تیز رفتار گھوڑے پرسوار ان کی میدان کی طرف پرواز کے بارے میں کسی نے خوب کہا ہے۔

بر فرس تندرو ہر کہ ترا دید گفت
برگ گل سرخ را باد کجا می برد
جس نے بھی تجھے اسب سبک سیر پہ دیکھا
بولا کہ گل سرخ ہے کاندھے پہ ہوا کے

راوی بیان کرتا ہے کہ میں نے دیکھا اور مجھے وہ منظر نہیں بھولتا کہ شہزادے کی ایک نعل کا تسمہ کھلا ہوا تھا اور انہوں نے چرمی موزہ نہیں پہنا ہوا تھا۔اب کیا شہادت کے لئے اس روحانی نشاط کو بھی آپ آرزوئے عروسی کا تسلسل کہیں گے؟

لکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام درخیمہ پر گھوڑے پر عنان بدست مستعد کھڑے تھے معلوم ہوتا تھا کہ کسی امر کے منتظر ہیں دفعتاً آپ نے شہزادے کی فریاد سنی لکھا ہے کہ حضرت امام علیہ السلام شکاری باز کی طرح آواز ستغاثہ پر لپکے اور لشکر اعداء پر حملہ آور ہوئے۔شہزادے کی فریاد کے الفاظ یہ تھے یا عماہ!اے چچا جان مدد کو آیئے جب امام

علیہ السلام شہزادے کے سرہانے پہنچے تو دیکھا کہ تقریباً ۱۲۰۰ اشقیا نے ان کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ امام علیہ السلام کے حملے سے سب تتر بتر ہو گئے۔ دشمنوں کا ایک فرد جو شہزادے کا سرتن سے جدا کرنے کے لئے گھوڑے سے اتر آیا ہوا تھا اپنے بھاگتے ہوئے ساتھیوں کے گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو گیا۔ وہ شخص جو روزہ عاشورا گھوڑوں کے سموں کے نیچے روندا گیا اور زندہ رہا دشمنوں کا آدمی تھا نہ کہ شہزادہ قاسم بن حسنؑ۔

جب امام علیہ السلام شہزادہ قاسم کے سرہانے پہنچے تو آپ کے چاروں طرف غبار اتنا زیادہ تھا کہ کچھ بھی اندازہ نہ ہوسکتا تھا کہ ماجرا کیا ہے لیکن جب غبار چھٹ گیا تو امام شہزادے کے سر کو دامن میں رکھے بیٹھے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

جان عمو تمہارے عمو جان پر یہ بہت شاق تھا کہ تم بلاؤ اور وہ پہنچ نہ سکیں یا تمہارے لئے کچھ کر ہی سکیں۔اسی دوران میں شہزادے نے آخری ہچکی لی اور راہی فردوس ہوئے۔

ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم وصلی اللہ علیہ محمد وآلہ الطاهرین باسمك العلی الاعظم الاعز الاجل الاکرم یااللہ۔

اے خداوند عالم ہماری عاقبت بخیر فرما اور ہمیں حقائق اسلام کی معرفت عطا فرما۔

ہمیں جہالتوں اور نادانیوں سے نجات دے۔

ہمیں عمل کی توفیق اور خلوص نیت عطا فرما۔ ہماری شرعی حاجات برلا ہمارے وفات یافتگان کی مغفرت فرما۔

رحم اللہ من قرا الفاتحۃ مع الصلواۃ

مجلس دوم

الحمدلله رب العالمین باری الخلائق اجمعین والصلوٰة
والسلام علی عبدالله ورسوله وجیبه وصفیه
سیدناومولاناونبینا ابی القاسم المصطفی محمدوآله
الطیبین الطاهرین المعصومین۔

اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ
قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا
ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ [1]

تحریف خواہ وہ لفظی ہو یا معنوی نہ صرف اس عظیم ترین تاریخ سند کو جو ہماری دینی واخلاقی تربیت اور تعمیر کردار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے بے اثر یا کم اثر بنانے کا بنیادی سبب ہے بلکہ بعض اوقات ہماری انسانی دینی اور اخلاقی اقدار کو مسخ کرنے اور ہمارے کردار کی شکست کا باعث بنتی ہے۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس مقدس سند کو تحریف کی آلودگیوں سے پاک کریں اور اس کے چہرہ زیبا سے جعل و دروغ کی آلائشیں دور کریں۔ میرا وعدہ تھا کہ آج شب تحریف کے عوامل سے بحث کروں گا اور کل شب ہماری گفتگو حادثہ کربلا کی معنوی تحریفات کے بارے میں ہوگی۔

---

[1] سور المائدہ:۱۳

عوامل تحریف

ان عوامل کی دوقسمیں ہیں پہلی قسم عوامل عمومی کی ہے جوتواریخ عالم میں جا بجا موجود ہیں اور جنہوں نے تاریخ انسانیت کوتحریف سے دوچار کیا ہے اس عمومی تحریف میں عاشورا کو کوئی خصوصیت نہیں بلکہ ہر وہ واقعہ اس تحریف کے ذیل میں آتا ہے جو باہمی دشمنی وغیرہ کی بنا پر کسی قسم کی تحریف کا شکار ہوا ہو۔

دشمن اپنی معین ومخصوص اہداف کے حصول کے لئے یا متن تاریخ میں تبدیلیاں کرتا ہے اور یا پھر اس کی کوئی ایسی ناروا توجیہ کر دیتا ہے جو اس کی شخصی اغراض سے ہم آہنگ ہو۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔بس یہی عرض کر دینا کافی ہے کہ کربلا کے واقعات میں بھی اس قسم کی تحریف کا عمل دخل رہا ہے بایں معنی کہ دشمن انقلاب حسینی کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور جیسا کہ دنیا کا دستور ہے ہر مقدس انقلاب کی طرح اس کو بھی معاشرے میں خلل اندازی اور فساد انگیزی کا الزام دیا گیا۔

اموی حکومت نے انقلاب حسینی کو یہ رنگ دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور پہلے ہی دن سے اس کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ جناب مسلم کی کوفہ آمد پر حکومت کوفہ کے ابن زیاد کے نام فرمان میں یہی الفاظ تھے کہ مسلم بن عقیل مسلمانان کوفہ کے درمیان اختلاف اور فتنہ فساد پیدا کرنے کی غرض سے کوفے میں داخل ہو چکے ہیں فوراً جاؤ اور ان کی سرکوبی کرو اور جب جناب مسلم کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے سامنے دارالامارہ لے جاتے ہیں تو ابن زیاد یہی الفاظ کہتا ہے ''اے ابن عقیل اس شہر کے لوگ بڑے آرام وراحت اور امن چین سے رہ رہے تھے تم نے یہاں آ کر فتنہ پھیلا دیا اور لوگوں کے اطمینان کو غارت کر دیا''

جناب مسلم نے پوری جرأت و بے باکی سے جواب دیا'' ہم اس شہر میں بن

بلائے نہیں آئے بلکہ اس شہر کے لوگوں کی متواتر دعوت پر آئے ہیں جس کے لئے انہوں نے ہمیں بہت سے خطوط لکھے ان کے خطوط ہمارے پاس موجود ہیں ان میں صاف صاف لکھا ہے کہ تیرے باپ زیاد نے اپنے زمانہ حکومت میں یہاں کے نیک لوگوں کو قتل کیا ہے اور اچھے لوگوں پر بدکردار لوگوں کو مسلط کر دیا ہے رعایا پر طرح طرح کے ظلم کئے ہیں۔انہوں نے ہم سے درخواست کی کہ ان کی مدد کو پہنچیں اور عدل الٰہی قائم کریں۔اگرچہ اموی حکومت نے اس میں معنوی تحریف کی کوشش ضرور کی ہو گی۔لیکن تاریخ اس تحریف سے متاثر نہیں ہوئی۔کیونکہ آج آپ کو ایک بھی مورخ یا صاحبِ نظر ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ سکے کہ امام حسین علیہ السلام کا یزیدی حکومت کے خلاف قیام ناجائز تھا یا خدانخواستہ مسلمانوں میں اختلاف و افتراق ڈالنے اور اتحاد امت میں خلل اندازی کی غرض سے تھا اور چونکہ آپؑ نے ایسا کیا ہی نہیں لہٰذا دشمن واقعات کربلا میں تحریف نہ کر سکا۔

دراصل حادثہ کربلا میں جو کچھ بھی تحریف ہوئی ہے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دوستوں کے ہی ہاتھوں ہوئی ہے۔

من از بیگانگان ہرگز نالم
کہ بامن ہرچہ کردآں آشنا کرد
نہیں اغیار سے کوئی شکایت
کہ مجھ پر ظلم اپنوں نے کیا ہے

یہ ایک عامل تحریف کا ذکر تھا۔

عامل دوم

انسان بالطبع داستان سازی اور افسانہ تراشی کا میلان رکھتا ہے۔اور اس کا یہ میلان دنیا کی سب تاریخوں میں جابجا جھلکتا ہے۔ انسان میں ایک حس بطل پرستی (HERO WORSHIP) کی ہے جس کی انگیخت سے وہ قومی اور دینی ہیروؤں کے

متعلق افسانے تراشا ہے۔عید غدیر کی ایک محفل میں جناب ڈاکٹر شریعتی نے اپنی گفتگو کے دوران جنس بشر کی افسانہ سازی کے اس غیر معمولی میلان اور بطل پرستی کی حس متزاید کے بارے میں بہت خوبصورت بحث کی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اس کی ایک روشن دلیل یارلوگوں کے وہ افسانے ہیں جو انہوں نے بوعلی سینا اور شیخ بہائی جیسے نوابغ روزگار افراد کے بارے میں تراشے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بوعلی سینا نابغۂ عصر تھے اور غیر معمولی جسمانی اور ذہنی قوا کے مالک تھے لیکن لوگ بھی ان کے بارے میں افسانہ تراشی کی سب حدود پھلانگ گئے۔مثلاً یہ کہ ایک دفعہ بوعلی سینا نے تین میل کے فاصلے پر ایک آنے والے کے بارے میں بتا دیا کہ جو روٹی وہ کھا رہا ہے وہ روغنی ہے ہمنشینوں نے پوچھا کہ اتنی دور سے آپ نے کیسے دیکھ لیا کہ وہ روٹی کھا رہا ہے اور پھر یہ کیسے جان لیا کہ وہ روٹی روغنی بھی ہے(کہتے ہیں کہ ان کی نظر بہت تیز تھی)۔انہوں نے جواب دیا ''میں نے روٹی کے گرد مچھر منڈلاتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ وہ روغنی ہے'' ظاہر ہے کہ یہ ایک من گھڑت افسانہ ہے کیونکہ جو شخص تین میل کے فاصلے پر مچھر دیکھ سکتا ہے وہ روٹی کے روغن کو مچھروں کی موجودگی کے بغیر بھی دیکھ سکتا ہے۔

یا مثلاً جس زمانہ میں وہ اصفہان میں زیر تعلیم تھے ان دنوں کے بارے میں انہوں نے بتایا۔جب میں آدھی رات کو مطالعہ کے لئے اٹھتا تو کاشان کے ٹھیٹھروں کے ہتھوڑوں کا شور مجھے پڑھنے نہیں دیتا تھا پہلے تو لوگوں کو یہ ماننے میں بڑا تردد ہوا لیکن جب تجربے کے طور پر انہوں نے کاشان کو ٹھیٹروں کو رات کے وقت کام کرنے سے منع کر دیا تو اس رات میں بڑے آرام وسکون سے مطالعہ کر سکا۔(یا سو سکا)۔ظاہر ہے کہ یہ محض افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ کاشان اصفہان سے تقریباً ۳۰۰ کلومیٹر دور ہے۔

پھر شیخ بہائی کے بارے میں کتنے اور کیسے کیسے افسانے تراشے گئے؟ مقصد

یہ ہے کہ ایسی چیزیں ضرور موجود ہیں جو صرف حادثہ عاشورا ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جیسا میں نے گزشتہ شب عرض کیا کہ ہر بڑے واقعے میں تحریف کو کسی نہ کسی طور پر راہ مل ہی جاتی ہے۔ اب لوگ بوعلی سینا کے بارے میں جو چاہیں کہیں کیا فرق پڑتا ہے؟لیکن ایسے عظیم افراد جو انسانوں کی پیشوائی کے مقام پر فائز ہوں اور جن کا قول فعل عمل اور باطل کے خلاف ان کا قیام حجت کی حیثیت رکھتا ہو اور جن کی سیرت گفتار شخصیت اور اسوہ زندگی سے نوع بشر کے کردار کی تشکیل وتکمیل ہوتی ہو۔ان کی عظمت کو تحریف یا افسانہ تراشی کے مجروح اور داغدار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ تحریف کے دو ہی مقصد ہو سکتے ہیں۔فرط عقیدت میں کسی کے مقام کو مافوق الامکان کی حد تک بلند کر دینا یا فرط بغض و عداوت میں کسی کو انتہائی پستی میں گرا دینا اسی لئے جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

هلك فی اثنان، محب غال و مبغض قال یعنی دو شخص میری وجہ سے ہلاک ہوں گے۔ایک میری محبت میں غلو کرنے والا اور دوسرا میرے بغض میں حد سے گزرنے والا اسی وجہ سے حجج خدا کے بارے میں تحریف ایک ناجائز و مذموم فعل ہے جو پورے معاشرے پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ مترجم اب حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے بارے میں ہم نے فرط عقیدت میں کیا کیا افسانے نہیں تراشے؟

افسانہ ساز عقیدت مند

یہ مسلم ہے کہ علی علیہ السلام خارق عادت شجاعت کے مالک تھے اور دوست دشمن سبھی اس حقیقت کے معترف ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ جو بھی آپؑ کے مقابلہ میں آیا آپ نے اسے چت کر دیا اور کوئی بڑے سے بڑا شہزور بھی اسد اللٰہی قوت کی تاب نہ لا سکا یہ یقینا ایک فوق الفطرت خصیصہ ہے۔لیکن ہر قوم کی تاریخ میں ایک ایسا انسان ضرور موجود رہا ہے۔جس کا میدان جنگ میں کوئی شخص حریف نہیں بن سکا۔

لیکن افسانہ تراش عقیدت منداس پر قناعت نہ کر سکے اور آپ حضرات کو خوب معلوم ہے کہ اس بارے میں وہ کہاں تک پہنچے ہیں۔مثلاً جنگ خیبر میں جب آپؑ مرحب سے روبرو ہوئے جو مورخین کے مطابق خود بھی غیر معمولی قوت وہیبت رکھتا تھا اب مورخین ہی کا بیان ہے کہ علی علیہ السلام نے اسے ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کو دو نیم کر دیا۔اب اس دونیم سے کیا مراد ہے؟ کیا وہ بالکل دوحصوں میں تقسیم ہو گیا تھا یا کم وبیش مثلاً سینہ تک یا کمر تک؟لیکن یار لوگوں کے لئے اس لفظ نے میدان تحریف میں طبع آزمائی کے جوہر دکھانے کے لئے ایک وسیع افق کھول دیا۔اور نتیجتاً ایسے ایسے افسانے تخلیق ہوئے کہ جن پر کاتب تقدیر بھی خامہ دردھان ہے مثلاً جبرائیل علیہ السلام کو ارشاد خداوندی ہوا:''فوراً زمین پر میدان خیبر میں پہنچواور پیشتر اس کے کہ علی کی تلوار مرحب اوراس کے مرکب کو دونیم کرتی ہوئی زمین تک پہنچے اسے رستے ہی میں روک لو کیونکہ آج ہم علی کے تیوروں میں غضبنا کی کی وہ جھلک دیکھ رہے ہیں کہ عجب نہیں کہ ان کی تلوار زمین کو بھی دونیم کر دے۔تم اپنے بازو پر اس وار کو روکو اور اسداللہ کی تلوار نے اس صحت وضبط سے مرحب کے جسم کو دونیم کیا کہ اگر ایک حصے کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور دوسرے کو دوسرے پلڑے میں رکھا جاتا تو وزن مثقال بھر کی بھی کمی بیشی نہ نکلتی۔نیز اس زمین شگاف وار کو روکنے کی کوشش میں جبرائیل علیہ السلام کا ایک پر زخمی ہو گیا جس کی وجہ سے روح الامین پورے چالیس روز وحی برداری کے فرائض انجام نہ دے سکے اور زخم مندمل ہونے تک زمین ہی پر رہے اور چالیس روز کی بے اطلاع غیر حاضری کے بعد جب حضور خداوندی میں پہنچے تو جواب طلبی ہو گئی۔عرض کیا الہ العالمین ماموریت پر تھا۔آپ ہی نے تو بھیجا تھا''ٹھیک ہے لیکن جلدی واپس کیوں نہیں لوٹے؟ حضور علی علیہ السلام کی تلوار سے میرا پر کٹ گیا تھا جس کی وجہ سے میں لمبی پرواز کے قابل نہ رہا تھا زخم کے مندمل ہونے میں چالیس روز لگ گئے اور جونہی زخم ٹھیک ہوا حاضر خدمت ہو گیا ہوں۔

ایک روایت کے مطابق آپ کی تلوار اتنی نرم ملائم اور سریع العمل تھی کہ مرحب کو اپنے جسم اور گھوڑے کے دونیم ہونے کا احساس تک نہ ہوا اور وہ سمجھا کہ ذوالفقار کا وار خالی گیا۔ کہنے لگا علی! بس اتنی ہی ہمت تھی؟ تمہاری وہ شہزوری کیا ہوئی؟ آپؑ نے فرمایا اب تو وار کر۔لیکن جونہی اس نے حرکت کی آدھا جسم اس کا اس طرف گر گیا اور آدھا اس طرف۔

حاجی نوری نے اپنی کتاب لولووالمرجان میں ایسے افسانوں پر خوب تنقید کی ہے وہ کہتے ہیں جنگ صفین میں جناب ابوالفضل العباس کی شجاعت کے بارے میں ان لوگوں کا کہنا ہے حالانکہ اس جنگ میں ان کی شرکت ثابت نہیں۔اور اگر ہو بھی تو بھی ان کی عمر اس وقت صرف پندرہ سال تھی کہ حضرت عباس نے دشمن کے ایک سپاہی کو پکڑ کر ہوا میں اچھال دیا پھر دوسرے کو پھر تیسرے کو پھر چوتھے کو حتیٰ کہ ۸۰ سپاہیوں کو اتنی تیزی سے فضا میں پھینکا کہ ۸۰ ویں سپاہی کے پھینکنے تک ابھی پہلا سپاہی بھی زمین پر واپس نہیں پہنچا تھا۔

اور پھر جب وہ یکے بعد دیگرے زمین پر گرنا شروع ہوئے تو زمین تک پہنچتے پہنچتے پسر شیر خدا کی تلوار سے ہر ایک کے دو دو ٹکڑے ہوتے گئے۔

حادثہ کربلا میں واقع ہونے والی تحریفات کا ایک حصہ قصہ سازیوں اور داستان تراشیوں کے نتیجے میں وجود میں آیا جس میں خوب خوب تحریف اور مسلسل تحریف ہوتی رہی۔ غالباً اسی وجہ سے یورپی مستشرقین کی تاریخ کے بارے میں خیال ہے کہ وہ بہت طویل اور مفصل ہے۔

مثلاً آقائے دربندی نے ''اسرار الشہادت'' میں افواج یزید کے بارے میں لکھا ہے کہ عمر سعد کا لشکر چھ لاکھ سواروں اور دس لاکھ پیادوں پر مشتمل تھا جو سب کے سب اہل کوفہ تھے لیکن مقام فکر ہے کہ آخر کوفہ کتنا بڑا شہر تھا جس میں صرف فوجیوں کی تعداد سولہ لاکھ تھی یہ ایک نیا شہر تھا جس کی عمر ۳۰ یا ۳۵ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

یہ شہر خلیفہ دوم جناب عمر بن الخطابؓ کے حکم سے ان کے عہد میں تعمیر ہوا اور اسے فوجی چھاؤنی قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہ اس وقت کی اسلامی دنیا کے تقریباً مرکز میں واقع تھا۔ رقبے کے لحاظ سے اس میں فوجی اور شہری ملا کر کل ۸۰ ہزار یا زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ باشندوں کی گنجائش تھی۔ یہ کہ اس کی فوجی بیرکوں میں ۱۶ لاکھ سپاہیوں کے رہنے کی گنجائش تھی جو سارے کے سارے صرف ۸۲ مجاہدین حسینی کے مقابلے میں کربلا کے میدان میں جھونک دیئے گئے اور ان میں سے ۳ لاکھ سپاہی امام علیہ السلام کے ہاتھوں فی النار ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ عقل میں آنے والی بات نہیں بلکہ خود اس واقعے کی عظمت واہمیت کو بھی مجروح کرتی ہے۔

ایک شخص شہر ہرات کے بارے میں کہہ رہا تھا: ''ہرات کسی زمانے میں اتنا شہر تھا اتنا بڑا۔ اتنا بڑا کہ لوگوں نے کہا ہاں ہاں اتنا بڑا کتنا بڑا؟ کہنے لگا اس وقت اس میں سری پائے بیچنے والے یک چشم ''احمد'' اکیس ہزار تھے اب اندازہ فرمائیں اس ہرات کی کل آبادی کیا تھی۔ اس میں کل کتنے سری پائے والے تھے اور ان میں سے کتنوں کا نام احمد تھا جس میں صرف یک چشم احمدوں کی نفری ۲۱ ہزار تھی۔

دیکھا آپ نے قصہ سازی کے اس میلان نے کیسے کیسے کام کئے ہیں؟ ہمیں ایک مقدس سند کو افسانہ تراشوں کے حوالے کرنے سے باز رہنا چاہئے کیونکہ ان لنا فی کل خلق عدولا یمشون جادہ حق سے منحرف لوگوں کی کمی نہیں ہمارا فرض ہے کہ اپنی مقدس روایات کو افسانہ سازوں کے چنگل سے نجات دیں۔ اب ہرات کے بارے میں جو جی میں آئے کہیے لیکن کربلا تو ہرات نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ انسانی کا وہ عظیم واقعہ ہے جو ہمارے لئے ایک مکتب کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے زندہ رکھنے کے لئے ہر سال ہم اس کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

کیا اس عظمت کردار کے حامل کردار ساز واقعے میں اس قسم کے واہی قصے داخل کرنا جائز ہے؟

عامل سوم

اب تک ہم تحریف کے دوعوامل پر بحث کر چکے ہیں جن میں سے ایک شخصی یا طائفی اغراض اور دشمنوں کی عداوت ہے جو انسانی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے جب کہ دوسرا زیب داستان کی خاطر واقعات گھڑنے کا ہے جو تاریخ عالم میں جا بجا جھلک رہا ہے۔

اب ہم تیسرے عامل تحریف کو زیر بحث لاتے ہیں جو بالخصوص حادثہ کربلا سے تعلق رکھتا ہے اور اس عظیم حادثہ میں تحریفات کا ذمہ دار ہے۔

پیشوایان دین نبی علیہ السلام کے زمانے ہی سے اور خصوصاً ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے زمانے سے تاکید فرماتے آئے ہیں کہ حسین علیہ السلام ابن علی علیہ السلام نام ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہئے جس کے لئے ضروری ہے کہ ہر سال آپ کے نام کی یاد تازہ کی جائے یہ تاکید کیوں کی گئی؟ اسلام کا یہ کیا تقاضا ہے۔؟ ائمہ اطہار علیہم السلام نے کس لئے اس کے بارے میں خصوصی اہتمام فرمایا ہے؟ امام علیہ السلام کی زیارت کے لئے اتنے اہتمام کا کیا مقصد ہے؟ اس واقعہ کی تبلیغ و ترویج کی اس قدر اہمیت کیوں ہے؟ یہ نکات بہت غور طلب ہیں۔

ممکن ہے کہ اس کے جواب میں کوئی یہ کہے کہ مصائب حسینی کے ذکر کے لئے مجالس کے انعقاد کا بنیادی مقصد جناب زہرا صلواۃ اللہ علیہا کی تسلئ خاطر ہے لیکن کیا یہ ایک بھونڈا مذاق نہیں ہے کہ آج چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود جناب زہرا سلام اللہ علیہا تسلیٔ خاطر کی محتاج ہوں جب کہ خود امام علیہ السلام کے فرمان کے مطابق بھی اور ضرورت دینی کے تقاضے کی روس سے بھی جناب زہراؑ اور جناب سید الشہداؑ دونوں جنت الفردوس میں ایک دوسرے کے ساتھ موجود ہیں۔

یہ کیا بات ہوئی؟ کیا جناب زہراؑء خدانخواستہ خاکم بدہن بچہ ہیں کہ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی باوجود اس کے کہ نور نظرؑ آنکھوں کے سامنے موجود

ہیں گریہ فرما رہی ہیں اور ہماری تسلیوں کی محتاج ہیں۔یہی وہ باتیں ہیں جو دین کوخراب کرتی ہیں۔امام مظلوم علیہ السلام نے اسلام میں مدرسہ عمل کی بنیاد رکھی وہ مکتب کیا تھا اور اس کی تعلیم کیا اور کیسی تھی؟اس موضوع پر تفصیلی گفتگو انشاء اللہ کل شب ہوگی۔اب مجلس عزا کی اہمیت وضرورت کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

مجلس عزا کیوں؟

حسین علیہ السلام انقلاب اسلامی کا ایک عملی نمونہ ہیں ہم نے چاہا کہ حسین علیہ السلام زندہ رہیں اور کم از کم سال میں ایک بار اپنی تمام تر شیریں نگاہی عالی ظرفی اور ولولہ انگیز عظیم شخصیت کے ساتھ ظاہر ہوں اور پکار کر فرما دیں۔ **الا ترون الی الحق لایعمل به والباطل لاینهی عنه** کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اور باطل سے نہی نہیں کی جا رہی۔ہمیں خبردار فرما دیں کہ **الموات اولیٰ من رکوب العار** (ننگ وعار کی زندگی سے موت بہتر ہے) اور کربلا کی طرف اپنے کوچ کا جواز یوں پیش فرمائیں۔ **انی لا اری الموت الا السعادة والحیاة مع الظالمین الابرما**۔میری نظروں میں موت عزت وسعادت ہےلیکن ظالموں کے ساتھ زندگی کا تصور بھی میرے لئے ہمت شکن ہے۔ہماری آرزو تھی کہ یہ جملہ زندہ رہے اور اس کے ساتھ امام علیہ السلام کا ایک اور جملہ بھی زندہ رہے۔ **هیهات منا الذلة** (ذلت ہم سے بہت دور ہے)۔

حسین علیہ السلام جیسا عظیم اور مردانہ صفات وخصائص کا حامل انسان چشم فلک نے کب دیکھا ہے جو اپنے شش ماہ شیر خوار سے لے کر ۳۲ سالہ لخت جگر اور بیسیوں جان نثاروں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر تھک چکا ہے اور اب اپنے بعد اپنے حرم اور بہنوں بیٹیوں کے یقینی تاریک مستقبل کے تصور سے اس کا برا حال ہےلیکن اس خستہ حالی کے باوجود اس کی مردانگی کا یہ عالم ہے کہ۔لباس پھٹا ہوا غبار میں اٹا ہوا تمام جسم نازنین کٹا

ہوا پھٹا ہوا یہ کون ذی وقار ہے بلا کا شہسوار ہے کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا۔

لشکر باطل کے تیس ہزار جنگ آزمودہ ظالموں کے مقابلے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر نیستان ہے جو تیس ہزار بھیڑیوں کے مقابلے میں کھڑا ہے کہ جس طرف نظر ڈالتا ہے اس کی نگاہ برقبار سے پتے پانی ہوئے جا رہے ہیں اور جس دستے پر لپکتا ہے اس کے پرے الٹ کر رکھ دیتا ہے۔

یہ بالیقین حسین ہے یہ بالیقین حسین
بنی کے دل کا چین ہے علی کا ہے یہ لاڈلا

ہم نے چاہا کہ اس کا نصب العین زندہ رہے۔اس کا مکتب زندہ رہے اس کی تربیت زندہ رہے اس کی عظیم روح اس قوم کے قالب میں رواں رہے اور اس کے نورانی پرتو اسے ملت کے چہرے کے نقش ونگار میں آب و تاب اور خدوخال میں نکھار پیدا ہو۔

ہم نے چاہا کہ اس کا نورانی فلسفہ زندہ اور روشن رہےاور کسی اضمحلال سے دو چار اور اس قوم کے تغافل کا شکار نہ ہو۔کیونکہ ہماری زندگی ہماری انسانیت ہمارا شرف اس سے وابستہ ہے اور اسلام کو اس کے وسیلے سے یقیناً زندہ رکھا جا سکتا ہے لہٰذا ہم نے کوشش کی کہ مجالس عزاء کو زندہ رکھا جائے۔

یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ عزائے امام مظلوم اپنے اندر ایک عظیم و مخصوص فلسفہ رکھتی ہے۔اس کی بقاء کے لئے جتنی بھی کوشش کی جائے کم ہے بشرطیکہ اس کا ہدف معین و مشخص ہو لیکن بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ لوگوں کو مکتب حسین سے آشنا کئے بغیر ہی ہم انہیں انقلاب حسینی میں کارفرما فلسفے سے واقف و متعارف اور مقام حسین سے شناسا کر سکیں گے۔اس کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ لوگ ہماری مجالس میں آئے بیٹھے اور ایک نامفہوم و نامشخص اور بے مقصد گریہ

زاری کر کے چلتے بنے۔

اس سے ایک اہم نکتہ پیدا ہوتا ہے جسے حاجی نوری مرحوم نے **لؤلؤ ومرجان** میں حکایت کے طور پر ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کچھ لوگ میرے پاس آئے اور مجھ سے روضہ خوانی کی فرمائش کی کیونکہ امام مظلومؑ پر گریہ کرنے کا بڑا ثواب ہے اتنا بڑا کہ جس بھی وسیلے سے اس کے لئے استفادہ کیا جائے جائز ہے۔ تو یہ فرمایئے کہ آج لوگ اس نظریے کے جواز میں مارکس اور لنین کے نظریے سے استدلال کرنے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتے کہ وسیلے کے حسن وقبح کا معیار ہدف ہے اگر آپ کا ہدف درست ہے تو وسیلہ جو بھی اس کے حصول کے لئے اختیار کریں عین جائز اور درست ہے۔ میں نے عرض کیا جناب ہمارے سامنے واقعی ایک بہت مقدس ہدف ہے اور وہ یہ ہے کہ امام مظلوم پر گریہ زاری کی جائے۔ لیکن اس کا فلسفہ کیا ہے؟ کہنے لگے ہمیں فلسفے سے کوئی کام نہیں۔ امام حسینؑ پر رونا ایک نہایت ہی اچھا اور موجب ثواب عمل ہے میں نے کہا ٹھیک ہے ضرور رونا چاہئے اور خوب رونا چاہئے اور اس کے لئے ہر جائز و ناجائز وسیلہ اختیار کرنا بھی درست ہی ہوگا۔ کیونکہ آپ کے خیال کے مطابق اگر ہدف مقدس تو اس کے لئے وسیلہ جو بھی جائز و ناجائز اختیار کیا جائے جائز ہے۔ لیکن کیا اس مقصد کے لئے کوئی اہانت آمیز اور تمسخر انگیز تعزیہ بنانا بھی جائز ہے؟

کہنے لگے ''اس سے آنسو جاری ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہوتے ہیں تو جو کچھ بھی آپ نے کیا ہے قطعاً جائز ہے'' یعنی بگل بجائیے ڈھول پیٹے مرثیہ خوانی کیجئے۔ مرد کو زنانہ لباس پہنایئے۔ قاسم کی سہاگ سیج سجایئے۔ جس کو جی چاہئے شہید بنا دیجئے جسے چاہئے اس کا مرتبہ گرا دیجئے مردوں کو زنانہ لباس پہنا دیجئے اور جو بھی بڑے سے بڑا گناہ کر لیجئے۔ معاف ہے کیونکہ آپ کا ہدف بہت مقدس ہے۔ بہت ہی مقدس۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے کربلا کے واقعات میں ہر جگہ دست تحریف دراز کیا ہے۔ دس پندرہ سال کی بات ہے کہ میں ایک بزرگ عالم مرحوم آقای سید محمد حسین

نجف آبادی کے پاس اصفہان گیا ہوا تھا ان دنوں حال ہی میں ایک مجلس میں میں نے ایک روضہ خوان سے ایک نہایت عجیب وغریب واقعہ سنا تھا۔ روضہ خوان کے فنکارانہ بیان سے حاضرین مجلس پر شدید رقت طاری ہوئی اور انہوں نے حد سے زیادہ گریہ کیا۔ میں نے وہ واقعہ مرحوم کے سامنے نقل کیا۔

من گھڑت!

متوکل عباسی کے عہد حکومت میں ایک بڑھیا امام حسین علیہ السلام کی زیارت کو جانے کی خواہش مند تھی۔ اس زمانے میں لوگ قافلوں کی شکل میں ایسے سفر پر جاتے تھے۔ اس عورت پر بارہا دست درازی کی گئی اور پھر اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے گئے۔ اور بالآخر اسے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ جب وہ غرق ہونے لگی تو اس نے صدائی استغاثہ بلند کی اور زور سے یا ابوالفضل یا ابوالفضل پکارا۔ وہ غرق ہوا ہی چاہتی تھی کہ ایک سوار تشریف لائے ان کا گھوڑا پانی کی سطح پر کھڑا تھا فرمانے لگے۔ میرے گھوڑے کی رکاب تھام لو جب اسے اس میں تردد ہوا تو آپ نے فرمایا تو کیوں ہاتھ نہیں بڑھاتی۔ رکاب کیوں نہیں پکڑتی؟ عورت نے عرض کیا میرے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ذاکر نے اس واقعے کی پیشہ ورانہ تفصیل سے سامعین کو خوب رلایا۔ میں نے جب یہ سارا واقعہ سید نجف آبادی کے گوش گزار کیا تو انہوں نے کہا کہ اس کی حقیقت میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کہاں سے شروع ہو کر یہاں تک پہنچا۔ کہنے لگے۔ اصفہان کے ایک مشہور واعظ کے حوالے سے (حسن اتفاق سے جن سے میری شناسائی بھی تھی۔) یہ بات مجھ تک پہنچی کہ اصفہان کی عظیم ترین مجالس میں سے ایک میں حاج میرزا حسین خادمی جو اصفہان کے علمائے اعلام میں سے تھے۔ تقریر کر رہے تھے۔ ایک اور معروف واعظ بھی مجلس میں حاضر تھے۔ جنہیں سب سے آخر میں تقریر کرنا تھی۔ ان کا بیان ہے کہ اس مجلس کا آخری واعظ میں تھا۔ علما یکے بعد دیگرے

آتے اور تقریر کر کے رخصت ہوتے رہے ان میں ہر ایک اپنے زور خطابت کے جوہر دکھاتا اور سامعین کو شدت گریہ سے سینہ زنی کرا کر منبر سے اتر کر کچھ مدت منبر کے پہلو میں بیٹھا رہتا تا کہ اگلے مقرر کے ہنر کا جائزہ لے اسی طرح ظہر ہو گئی اور میری باری آنے تک علماء وہ سب کچھ کہہ گئے تھے جو مجھے کہنا تھا حتیٰ کہ نہ میرے ذہن میں کوئی کہنے کی بات باقی رہ گئی تھی اور نہ ہی میرے خیال میں سامعین کے ذخیرہ اشک میں کوئی آنسو ہی باقی رہ گیا تھا چنانچہ میں نے جلدی میں یہ قصہ گھڑا اور جب منبر پر جا کر اسے بیان کیا تو یوں سمجھیے کہ مجلس کربلا بن گئی۔ اور کامیاب ترین قرار دی گئی اسی روز عصر کے وقت مجھے ایک اور مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں ایک اور روضہ خوان میرا ظہر کے وقت کا تراشا ہوا یہی جعلی قصہ بیان کر کے سادہ لوح سامعین کی آنکھوں سے آنسو اور ان کی جیبوں سے پیسے لوٹ رہا تھا۔

دراصل مکتب حسینی کو گدائی کا ایک وسیلہ سمجھنے اور اہل مجلس کو رلانے کی خاطر کسی بھی جائز وناجائز وسیلے کو بروئے کار لانے کے جواز کے اسی میلان نے تحریف و افسانہ تراشی کی بیسیوں راہیں کھولدی ہیں۔

مرحوم حاجی نوری نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ نظریہ درست ہو کہ ہدف وسیلے کو مباح کر دیتا ہے تو پھر دنیا میں کوئی بھی چیز ناجائز نہیں رہتی مثلاً۔ ادخال السرور فی قلب المومن (مومن کے دل کو خوش کرنا) ایک بہت پسندیدہ ہدف ہے لیکن کیا ایک مومن کو خوش کرنے کے لئے دوسرے مومن کی غیبت اس کے سامنے جائز ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے جس کے سامنے یہ خود ساختہ نظریہ قطعاً نہیں ٹھہر سکتا۔

وہ ایک اور مثال دیتے ہیں کہ اگر مومن کسی پرائی عورت کو پکڑ کر اس کا بوسہ لے لے اور جب کوئی شخص اعتراض کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس خاتون کا دل خوش کیا ہے جو کہ ایک مستحب عمل ہے۔ اسی طرح زنا شراب لواطت کے بارے میں

قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مصائب امام مظلوم پر رلانے کی خاطر کوئی ناجائز وسیلہ اختیار کرنا حرام اور گناہ ہے اور خدا شاہد ہے کہ امامؑ کے فرمان کی خلاف ورزی کے علاوہ اسلام کی بھی توہین ہے جس کی سربلندی کے لئے امام مظلوم نے تن من دھن کی بازی لگا دی اور چھ ماہ سے ۳۲ سال تک کی عمر کے ۱۸ پارہ ہائے جگر اور بیسیوں انصار اور جان نثاروں کی قربانی اور خاندان رسالت کی بہو بیٹیوں کی اسیری اور قید و بند کو قبول اور برداشت کیا۔

لانے کا عجیب طریقہ

أَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ أَقَمْتَ الصَّلَاةَ وَ آتَيْتَ الزَّكَاةَ وَ أَمَرْتَ بِالْمَعْرُوفِ وَ نَهَيْتَ عَنِ الْمُنْكَرِ

گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے نماز قائم کی زکوٰۃ دی نیکی کا حکم دیا اور بدی سے نہی فرمائی۔

حاجی نوری اپنی کتاب لولو والمرجان ایک یزدی عالم کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھ سے بیان کیا ''جوانی میں میں خراسان کے سفر کے دوران ایک ویرانے سے گزر رہا تھا جو نیشاپور اور تربت کے نزدیک ایک گاؤں سے ملحق تھا۔ میری چونکہ کسی سے واقفیت نہ تھی اس لئے میں گاؤں کی مسجد میں چلا گیا جس میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ تھوڑی دیر میں پیش نماز صاحب آ گئے اور ہم سب نے ان کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ پھر وہ منبر پر جا کر مجلس پڑھنے لگے۔ اتنے میں مسجد کا خادم آ گیا اور اس کی جھولی میں سنگریزے بھرے ہوئے تھے جو اس نے منبر کے پاس رکھ دیئے میں بڑا حیران تھا کہ یہ کیا راز ہے کہ اتنے میں مولوی صاحب نے مناقب کے بعد مصائب کی طرف گریز کیا اور حکم دیا کہ سب چراغ اٹھا کر باہر لے جائے جائیں جونہی مجلس گاہ تاریک ہوئی مولوی صاحب نے سامعین پر سنگ باری شروع کر دی۔ (خندہ حاضرین) کوئی

''ہائے میرا سر'' پکارا کوئی ''ہائے میرا ہاتھ'' اور کوئی آہ ''میرا سینہ'' کی فریاد کرنے لگا اور شور کا ایک طوفان مچ گیا۔ پتھر ختم ہونے کے بعد جب چراغ واپس اندر لائے گئے تو میں نے دیکھا کہ کسی کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ کسی کا منہ سوجا ہوا ہے اور کسی کا ہاتھ زخمی ہے سب زخمی روتے چیختے اور آنسو بہاتے مسجد سے نکلنے لگے۔ میں نے مولوی صاحب کا پیچھا کیا اور تھوڑے سے فاصلے پر انہیں جا لیا اور ان سے اس عجیب وغریب تصرف کا سبب دریافت کیا۔ فرمانے لگے میں نے ان لوگوں کو ہر طرح آزمایا لیکن یہ مصائب کے کسی بھی سخت سے سخت بیان سے متاثر نہ ہوتے تھے لیکن چونکہ غم امام مظلومؑ میں آنسو بہانا بڑے ثواب کا کام ہے جس سے نہ رونے والا محروم رہتا ہے۔ لہٰذا جب یہ لوگ کسی اور تدبیر سے نہ روئے تو میں نے گریہ پیدا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا اور چونکہ ہدف وسیلے کو مباح کرتا ہے اس لئے اگرچہ یہ وسیلہ کچھ شقاوت کا پہلو لئے ہوئے تھا لیکن چونکہ اس کا ہدف مقدس تھا اس لئے یہ وسیلہ بھی درست اور جائز تھا۔

پس قضیہ کربلا میں ایک عامل خصوصی جس کا ان تحریفات اور قصہ سازیوں میں بہت دخل رہا ہے وہ یہی رونے رلانے کے ثواب وجزا کا نظریہ ہے اور جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس عامل نے حادثہ کربلا کے بارے میں جعل وتراش کی کتنی راہیں کھولی ہیں۔

خدا کی قسم ہے کہ حاجی نوری نے بالکل درست فرمایا کہ اگر آج کوئی شخص حسین علیہ السلام پر ہونے والے مظالم پر گریہ کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ واقعات کربلا کی تحریف پر روئے اور اس بارے میں من گھڑت قصوں تراشیدہ داستانوں اور جھوٹے افسانوں پر روئے کیونکہ اس سے بڑا ظلم آپ پر کربلا میں بھی نہیں ہوا جس کی وجہ سے اقامت دین حنیف اور احیائے اقدار انسانی کے لئے آپؑ کی کوششوں اور قربانیوں کی عظمت متاثر اور اس عظیم واقعے کی افادیت ختم ہو رہی ہے۔

ملا حسین کاشفی کی کتاب روضۃ الشہداء کے بارے میں جس کا میں نے گزشتہ

شب ذکر کیا حاجی نوری فرماتے ہیں کہ جعفر جنّی اور عروسی قاسم کی داستانیں سب سے پہلے اسی کتاب میں ظاہر ہوئیں میں نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ اس میں اس قسم کے چند ہی واقعات ہوں گے۔ یہ کتاب فارسی میں ہے اور پانچ صدی قبل تالیف ہوئی تھی۔

ملاحسین کاشفی واعظ بھی تھا اور اتفاق سے صاحب علم بھی تھا اس بے انصاف نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ کلیلہ ودمنہ کے قصے کو اسی نے انوار سہیلی کے عنوان سے فارسی میں منتقل کیا اور اگرچہ اس میں بڑی عبارت آرائی کی ہے لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ کلیلہ ودمنہ کو اس نے خراب کر دیا۔ بہرحال آدمی پڑھا لکھا تھا۔

لوگ اس کی روضہ الشہداء کو پڑھتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ شخص شیعہ تھا یا سنی۔ لیکن اپنی بوقلمون فطرت کی وجہ سے جب شیعوں میں جاتا تو سو فیصدی شیعہ بن جاتا اور جب سنیوں میں جاتا تو خود کو حنفی بتاتا۔ وطن مالوف اس کا بیہق سبزوار تھا۔

سبزوار تشیع کا مرکز رہا ہے اور اس کے باشندے بہت متعصب شیعہ ہیں جب ملا کاشفی سبزواریوں کے درمیان ہوتا تو خود کو سو فیصدی غالی شیعہ ظاہر کرتا اور جب ہرات جاتا جہاں اس کی بیوی کے بھائی یا ہم زلف مشہور صوفی شاعر عبدالرحمن جامی رہتے تھے تو پھر سنی ہو جاتا لیکن شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر سنی ہی تھا۔ اور چونکہ واعظ بھی تھا۔ لہٰذا سبزواریوں کی مجلسوں میں روضہ خوانی بھی کرتا تھا۔ فارسی زبان میں مرثیہ میں لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب روضہ الشہداء اسی شخص کی تالیف ہے۔

کاشفی کی وفات ۹۱۰ ہجری میں ہوئی یہ کتاب اس نے نویں صدی کے اواخر یا دسویں صدی کے اوائل میں تالیف کی۔

شیخ مفیدؒ نے کتاب ''ارشادتحریر'' کی جو صحتِ سند کے لحاظ سے نظیر نہیں رکھتی اگر ہم دریافت کے حقائق کے لئے اپنے شیخ مفید رحمۃ اللہ علیہ کی اسی کتاب کی طرف رجوع

کریں تو ہمیں کسی دوسری کتاب کی احتیاج محسوس نہ ہو۔

اہل سنت کے تاریخ نگاروں میں طبری ابن اثیر یعقوبی ابن عساکر وغیرہ مشہور ہیں لیکن یہ بے انصاف ملا کاشفی عجیب شخص ہے جس نے اپنی نام نہاد تاریخ میں اصحاب امام علیہ السلام کی فہرست میں ایسے نام بھی تحریر کئے ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی ثابت نہیں۔ اسی طرح دشمنوں میں بھی اس نے ایسے نام گنوائے ہیں جو کہیں موجود نہ تھے اس طرح اس نے تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے۔

اب چونکہ فارسی زبان میں تالیف ہونیوالی یہ پہلی تاریخ نما کتاب تھی لہٰذا ان لوگوں نے جو اہل علم نہ تھے اور عربی زبان بھی نہیں جانتے تھے۔ اسے غنیمت جانا اور اسی میں سے واقعات کربلا کو مجالس عزا میں پڑھنا شروع کر دیا۔ جو آج ہم مجلس خوانی کو روضہ خوانی کہتے ہیں یہ نہ تو امام حسین علیہ السلام ہی کے زمانے میں اس نام سے معروف تھی نہ جناب جعفر صادق کے نہ جناب حسن عسکری کے نہ سید مرتضیٰ کے اور نہ خواجہ نصیر الدین طوسی کے زمانے میں اسے روضہ خوانی کہا جاتا تھا بلکہ آج سے صرف پانچ سو سال پہلے اس کو روضہ خوانی یعنی روضۃ الشہداء خوانی (کتاب روضۃ الشہداء) پڑھنا کا نام دیا گیا یعنی جھوٹ سے بھری ہوئی۔ یہی کتاب عوام کے ہاتھ لگی اور کسی نے بھی کربلا کی حقیقی تاریخ پڑھنے کی زحمت ضروری نہ سمجھی۔ پس روضۃ الشہداء کا پڑھنا روضہ خوانی اور روضۃ الشہداء کے پڑھنے والے روضہ خوان کہلانا شروع ہوئے اور روضہ خوانی کے نام سے جو ذاکری شروع ہوئی اس کا کام صرف روضۃ الشہداء کے افسانے پڑھنا تھا جس میں کربلا کی صحیح تاریخ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔

پھر آج سے ۶۰ یا ۷۰ سال پہلے ملا علی دربندی نے آ کر روضۃ الشہداء کے تمام مضامین پر اپنی طرف سے متعدد اضافے کر کے ایک نئی چیز بنا ڈالی جو گریہ وبکا اور نوحہ وواویلا کا مرقع تھی اسلام پر یہ واقعی رونے کا مقام ہے۔ حاجی نوری لکھتے ہیں کہ ہم حاج شیخ الحسین مرحوم تہرانی کے درس میں تھے جو بہت محترم بزرگوار تھے اور جن کے

درس سے حاجی نوری نے بڑا استفادہ کیا۔ انہی شیخ عبدالحسین کے محضر میں ایک روضہ خوان سید آ گیا اور مقتل کی ایک کتاب پیش کر کے درخواست گزار ہوا کہ شیخ اس کا مطالعہ کر کے بتائیں کہ معتبر ہے یا غیر معتبر۔ اس کتاب کا نہ اول تھا نہ آخر۔ صرف یہ الفاظ موجود تھے۔ ''صاحب معالم کے شاگرد ملا جبل عاملی کی تالیف ہے''۔ شیخ نے کتاب لے کر پہلے تو مولف کے حالات دیکھے جس کے نام سے ایسی کتاب لکھی گئی تھی پھر خود کتاب کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ جھوٹ کا پلندہ ہے اس سید کو انہوں نے تاکید کی نہ اس کتاب کو پڑھے اور نہ اس کے مواد کو لوگوں کے سامنے بیان کرے کیونکہ یہ ناجائز کام ہے پھر یہ کتاب ملا عاملی کی تالیف بھی نہیں اور جو کچھ اس میں ہے سراسر جھوٹ ہے۔

حاجی نوری لکھتے ہیں کہ یہ کتاب صاحب اسرار الشہادت کے ہاتھ لگ گئی اور انہوں نے اسے شروع سے آخر تک نقل کر دیا۔ ایک حکایت یہاں بیان کی جاتی ہے جو کافی اثر آفرین ہے۔

ایک شخص صاحب ''مقالہ'' آقائے محمد علی مرحوم کی خدمت میں جو آقائے وحید بہبہانی کے صاحبزادے تھے حاضر ہوا اور ان سے کہنے لگا۔ گزشتہ شب میں نے ایک بڑا وحشتناک خواب دیکھا ہے جس کے تصور سے میرے رگ و پے میں لرزہ طاری ہے۔

انہوں نے اس سے خواب کی تفصیل پوچھی تو اس نے کہا میں نے دیکھا ہے کہ اپنے دانتوں سے سید الشہداء کے جسم مبارک سے گوشت نوچ رہا ہوں یہ سن کر وہ لرز اٹھے اور سر جھکا کر گہری سوچ میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر انہوں نے اس سے کہا تم روضہ خوان تو نہیں ہو؟ اس نے کہا جی ہاں روضہ خوان ہی ہوں۔ تو انہوں نے کہا: یا تو آج سے روضہ خوانی کو بالکل چھوڑ دو یا معتبر تاریخوں سے واقعات نقل کیا کرو۔

گزشتہ شب میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص عاشورا کی صحیح اور سچی تاریخ کا مطالعہ کرے تو اسے مستند اور زندہ ترین تاریخ پائے گا جس کی تفصیلات اتنے تواتر

کے ساتھ وارد ہوئی ہیں اور اتنی مکمل ہیں کہ ان میں قطع نظر اس سے کہ تاریخی واقعات میں محض زیب داستان کے لئے توڑ مروڑ اور قصہ تراشی خود ایک قبیح و مذموم فعل ہے جھوٹے اور جعلی اضافوں کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ سچے واقعات تاریخ کربلا میں اتنے زیادہ اور پرتاثیر ہیں کہ امام مظلوم پر گریہ اور اس کے ثواب کی پوری ضمانت ان میں موجود ہے۔

مرحوم آخوند خراسانی فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ نئے اور ناشنیدہ مصائب کربلا سننے کے لئے آرزومند رہتے تھے انہیں چاہئے کہ جعل و دروغ کے غبار میں چھپے ہوئے سچے اور حقیقی واقعات کو تاریخ کربلا میں تلاش کریں کیونکہ وہ واقعی ناشنیدہ ہیں۔

گزشتہ شب میں نے عرض کیا تھا تاریخ میں امام علیہ السلام کے مکہ میں حجاز میں اور اثنائے سفر کربلا میں دیئے گئے خطبات آپؑ کے اصحاب باصفا کے خطبات اور آپؑ کے ساتھ لوگوں کے سوال و جواب کی تفصیل موجود ہے نیز اہل کوفہ اور یزیدی دشمنوں کے ساتھ آپ کی خط و کتابت کی تفصیل کے علاوہ کربلا میں حاضر و موجود چند دوست و دشمن عینی شاہدوں کے بیانات بھی تاریخ میں محفوظ ہیں جو معرکہ کربلا میں ہلاک یا شہید نہیں ہوئے۔ بلکہ کسی نہ کسی صورت میں زندہ بچ گئے دوستوں میں ایک عقبہ بن سمعان ہیں جو مکہ ہی سے رکاب امام علیہ السلام میں آئے تھے اور آپ کے لشکر میں شامل تھے جنگ کے دوران شہید نہیں ہوئے بلکہ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور بعد میں غلام ہونے کی وجہ سے رہا کر دیئے گئے۔ یہ عاشورہ کے وقائع نگار ہیں۔

دوسرا وقائع نگار حمید بن مسلم ہے جو عمر بن سعد کے لشکر میں تھا اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی روز عاشورہ کے وقائع نگاروں میں شامل ہیں۔

پھر سب سے بڑے عینی شاہد خود جناب امام زین العابدین علیہ السلام۔ کیا ہوا ہے جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ جب امام علیہ السلام تنہا رہ گئے تو آپ نے اپنی پھوپھی علیہا السلام سے عصا اور تلوار طلب کئے تا کہ نصرت امامؑ کے لئے دشمن کے مقابلہ میں نکلیں۔

آپ عاشورا کے ماجرہ کے عینی شاہد اور اس کے واقعات کے ثقہ ترین راوی ہیں۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنی چاہئے اور دروغ گوئی اور خیانت سے اس کی پناہ طلب کرنی چاہئے کیونکہ اس سے نہ صرف امام علیہ السلام آپؑ کے اصحاب باوفا ویاران باصفا اور آپؑ کے اہل بیت اطہارؑ کی عظمت میں کمی واقع ہو جاتی ہے بلکہ واضح طور پر ان حضرات کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ ہمیں تہ دل سے اور پورے خلوص نیت سے شرمسارانہ استغفار کرنا چاہئے تا کہ حسینی مکتب سے صحیح معنوں میں استفادہ کر سکیں۔

اور جناب ابو الفضل العباسؑ کی زندگی کے بارے میں کتب مقاتل نے کیا کچھ نہیں لکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپؑ کے لئے اور کوئی بھی فضیلت مذکور نہ ہوتی تو بھی آپ کی وفا کا صرف ایک کارنامہ آپ کی عظمت کردار اور علوشان کی توثیق کے لئے کافی تھا اور وہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ دشمنوں کو آپ کی ذات سے کوئی تعرض نہ تھا بلکہ لشکر یزید میں ایسے لوگ موجود تھے جو آپ کو کربلا کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کے آرزومند تھے لیکن آپؑ نے امام مظلوم کا ساتھ نہ چھوڑا اور باوجود اس کے کہ امامؑ نے واضح طور پر یہ فرمایا کہ جنہوں نے اس واقعہ کی جزوی تفصیلات کا اول سے لے کر آخر تک بچشم خود مشاہدہ فرمایا اور ساری عمر ان کو بیان فرماتے رہے یقین جانیے کہ کربلا کی تاریخ میں ایک نکتہ بھی غیر واضح یا مبہم نہیں ہے۔ پھر یہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ خود امام زین العابدین کے بارے میں روایات گھڑی جائیں۔ حاجی نوری نے اس قسم کی تحریف کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ روز عاشورا جب سید الشہداء کے سب اعزاء وانصار شہید ہو چکے اور آپؑ تنہا رہ گئے تو خیمہ زین العابدین میں خدا حافظی کے لئے تشریف لے گئے۔ سید سجادؑ نے عرض کیا بابا جان! صورتحال کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک جناب زین العابدین علیہ السلام ہر شے سے بے خبر تھے۔ آپؑ نے فرمایا جان پدر۔ بہت سخت جنگ ہوئی۔ عرض کیا: تو کیا نتیجہ ہوا۔ حبیب ابن مظاہر کہاں ہیں؟ حتیٰ

کہ باری باری اصحاب میں سے ہرایک کے بارے میں سوال کیا لیکن ہر بار جواب یہی ملا کہ شہید ہو گئے۔ پھر بنی ابی طالب میں سے ہر فرد قاسم بن حسنؑ علی اکبرؑ عباسؑ اور سب کے متعلق دریافت کیا جس کے جواب میں آپؑ نے ہرایک کی شہادت کی خبر دی۔

یہ سب کچھ قطعاً غلط۔اور صریحاً جھوٹ ہے کیونکہ امام زین العابدین ہرگز اتنے بیمار اور بے ہوش نہ تھے کہ انہیں خبر ہی نہ تھی کہ دشمن صرف میری جان کے درپے ہے اور میرے علاوہ کسی بھی شخص سے اسے کوئی سروکار نہیں ہر شخص کو یقینی قتل سے اپنی جان بچا کر کربلا سے چلے جانے کی اجازت دی لیکن سب سے پہلے آپ نے حضرت امام علیہ السلام میں اپنی جان دینے کے عہد کا اعلان کیا۔

شمر کا اَمان نامہ

کوفہ سے چلتے وقت شمر ذی الجوشن کی فوج کا ایک سپاہی جو ماں کی طرف سے شمر کا رشتہ دار تھا ابن زیاد کے پاس گیا اور کہنے لگا میرے کچھ مادری رشتہ دار حسینؑ کے لشکر میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جنگ میں ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ میری درخواست ہے کہ ان کے لئے مجھے ایک امان نامہ لکھ دیا جائے۔ شمر خود بھی جناب ام البنین والدہ محترمہ حضرت ابو الفضل العباس کے قبیلے بنی کلاب کا فرد تھا ابن زیاد نے جناب عباسؑ اور آپ کے بھائیوں کے لئے امان نامہ لکھ دیا۔ عاشورا کے روز وہ شخص خیام حسینیؑ کے قریب آیا اور با آواز بلند پکارا: میرے بھانجے کہاں ہیں۔ میں ان کے لئے ابن زیاد کی طرف سے امان نامہ لایا ہوں۔

جناب ابو الفضلؑ خدمت امام علیہ السلام میں خیمہ کے اندر تشریف فرما تھے لیکن اس شخص کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوئے اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ حتیٰ کہ امام علیہ السلام نے فرمایا۔ **اجیبوا وان کان فاسقا** (پکارنے والا خواہ فاسق ہی ہو۔ اس کی بات کا جواب ضرور دو) آقا کا حکم پا کر باہر آئے۔ اور اس شخص سے بولے۔ **ماتقول**

کیا کہتے ہو؟ اس نے جواب دیا میں آپ کے لئے خوشخبری لایا ہوں۔ ابن زیاد نے آپ کے لئے امان نامہ بھیجا ہے۔ اب آپ آزاد ہیں۔ آپ نے جواب دیا۔ خدا تجھ پر اور تجھے بھیجنے والے ابن زیاد پر لعنت کرے۔

تمہارے امان نامے پر بھی ہم لعنت بھیجتے ہیں اور اس امان پر بھی جو امام حق علیہ السلام کو مصائب میں گرفتار چھوڑنے اور لعین ابن لعین کی بیعت کو مستلزم ہو۔

شب عاشورا امام علیہ السلام کے رفع بیعت کے اعلان اور حتمی موت سے جان بچا لے جانے کے اذن عام پر سب سے پہلا ردعمل امام علیہ السلام کے اسی برادر رشید کی طرف سے ہوا۔ ان تمام احمقانہ مبالغوں سے قطع نظر یہ حقیقت مسلم ہے کہ آپ نہایت سلیم العقل سلیم الفطرت نہایت بہادر و دلیر اور بلند قامت جوان رعنا تھے انتہائی حسن وزیبائی کی وجہ سے آپ قمر بنی ہاشم کے لقب سے مشہور تھے۔ ''**وکان یدعیٰ قمر بنی ھاشم۔**''

آپ کی والدہ ماجدہ کے بارے میں یہ واقعہ قطعاً حقیقت پر مبنی ہے کہ علی علیہ السلام نے اپنے برادر محترم سے کہا میرے لئے ایک ایسی خاتون کا انتخاب کریں جو مردان میدان کی بیٹی ہو۔ تو جناب عقیل نے ام البنین کا انتخاب کیا اور کہا: یہی ہیں وہ خاتون جو آپ کے معیار پر بالکل پوری اترتی ہیں آپؑ نے فرمایا میری خواہش ہے کہ ان سے ایک ایسا بیٹا پیدا ہو جو میری شجاعت کا وارث ہو۔ امیر المومنین علیہ السلام کی یہ آرزو جناب ابو الفضل العباس کی صورت میں پوری ہوئی۔

ابو الفضل فرات پر

روایت ہے کہ روز عاشورا جناب عباسؑ خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہوئے اور یوں عرض گزار ہوئے ''مولا اب مجھے بھی اذن جہاد عطا فرمایئے میرے سینے میں اب وسعت تحمل نہیں رہی''۔ امام علیہ السلام نے کسی مصلحت کی بنا پر جواب دیا جان

برادر فی الحال تو بچوں کے لئے پانی کے حصول کی کوئی سبیل کرو۔ جاؤ شاید دریا سے کچھ پانی حاصل کر سکو۔ سقا کا لقب اس سے پہلے آپ کو مل چکا تھا جب چند روز پیشتر وہ ایک دفعہ دشمن کی صفوں کو توڑ کر دریا سے پانی لائے تھے یہ غلط ہے کہ خیام حسینی میں تین روز سے پانی نہ پہنچا تھا بلکہ اس دوران میں ایک دوبار پانی خیام میں لانے میں کامیابی ہو چکی تھی حتیٰ کہ شب عاشورا اکثر حضرات نے غسل بھی فرمایا۔

امامؑ سے اذن پا کر عباسؑ سوئے نہر علقمہ روانہ ہوتے ہیں۔ چشم فلک نے اب تک ایسا پر شکوہ منظر نہیں دیکھا۔ کیا عظمت ہے؟ کیا شجاعت ہے کیا دلاوری و جرأت ہے؟ کیا علو انسانی ہے کیا شرافت ہے؟ کیا معرفت ہے کیا فداکاری اور کیا ایثار و مروت ہے کہ تن تنہا خود کو نہر کے ۴۰۰ مسلح محافظوں کی فوج سے ٹکرا دیتے ہیں۔ ان کی صفیں درہم برہم کر کے نہر تک پہنچ جاتے ہیں اور مشک پانی سے بھر کر کنارے پر رکھ لیتے ہیں۔ ہوا بھی گرم ہے۔ جنگ بھی کر کے آئے ہیں۔ جب گھوڑا پیٹ تک گہرے پانی اترتا ہے تو چلو میں پانی بھر کر ہونٹوں تک لاتے ہیں۔ دور سے دیکھنے والے اپنے اندازوں میں الجھے ہوئے ہیں لیکن عباسؑ بھرا ہوا چلو پانی میں پھینک کر باہر نکل آتے ہیں۔ سب حیران ہیں کہ ابوالفضل نے پانی کیوں نہیں پیا؟

لیکن باہر آ کر ایک رجز میں خود سے جو خطاب کرتے ہیں اس سے سب کی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ پانی پینا کیوں گوارا نہیں کیا۔ رجز کے الفاظ یہ ہیں۔ ''اے ابوالفضل مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تو حسینؑ کے بعد زندہ رہے حسینؑ اب جلدی ہی شہید ہو جائیں گے۔ یہ مناسب نہیں کہ وہ تو خیمہ گاہ کے باہر تشنہ لب کھڑے ہوں اور تو پانی پیے۔ تیری مردانگی کیا ہوئی؟ مروت کہاں گئی؟ شرافت کو کیا ہوا؟ کیا حسینؑ تیرے امام نہیں ہیں؟ کیا وہ تیرے حاکم اور تو ان کا محکوم نہیں؟ کیا تو ان کا پیرو اور فرمانبردار نہیں؟ نہیں نہیں میرا دین مجھے اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ پیاسے ہوں اور تو سیراب ہو جائے''

آپ نے واپسی کا رستہ بدل دیا۔ پہلے سیدھے آئے تھے۔ اب بہت گراں

قیمت امانت کندھے پر ہے اس لئے نخلستان کا داخلی راستہ اختیار کرتے ہیں پوری ہمت اس کوشش پر مرکوز ہے کہ پانی کی مشک تیروں کی زد سے محفوظ صحیح وسلامت خیمہ گاہ تک پہنچ جائے۔لیکن اسی دوران میں یہ رجز آپ کی زبان پر جاری ہوتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔

والله لو قطعتمو یمینی
انی احامی ابداً عن دینی

خدا کی قسم اگرچہ تم نے میرا دایاں ہاتھ قلم کر دیا ہے لیکن میں دین حفاظت وحمایت امام سے کبھی باز نہیں رہوں گا۔

اور تھوڑی دیر کے بعد پھر آواز آتی ہے

یانفس لاتخش من الکفار
وابشری رحمة الغفار
مع النبی سیدالاطهار
ولو قطعو ابیغیهم لسیاری

اے نفس کفار سے خوف مت کھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بشارت یاب ہو۔کیا ہوا جو اعدا نے میرا بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا ہے مجھے نبی علیہ السلام کی حضوری کا شرف تو حاصل ہے۔

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دوسرا بازو بھی قلم ہو چکا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ ہر ممکن طریق سے مشک کو خیمہ گاہ تک پہنچانے کے لئے اس پر جھک جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھ سے بیان نہ ہو سکے گا۔اسے میں جناب ام البنین کی زبانی بیان کرتا ہوں جو اگرچہ کربلا میں موجود نہ تھیں لیکن جب انہیں خبر ملی کہ ان کے چاروں نورنظر کربلا میں شہید ہو گئے ہیں تو وہ روزانہ قبرستان بقیع میں جا کر اتنے سوز وگداز سے نوحہ سرائی کرتیں کہ سننے والے بے ساختہ رو پڑتے تھے۔حتیٰ کہ ایک روز مروان بھی جو

آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بدترین دشمن تھا انکا نوحہ سن کر رو دیا۔

یہ غمدیدہ خاتون یوں تو اپنے چاروں ہی بیٹوں کے لئے مرثیہ خوانی کرتیں۔لیکن بعض اوقات صرف اپنے سب سے بڑے نورنظر جناب ابوالفضل کے فراق میں جو کمالات جسمانی و ذہنی و روحانی میں اپنے سب بھائیوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے بڑی دلسوزی سے نوحہ کرتی تھیں۔ان کے ایک مرثیہ کو عربی ادب میں خاص مقام حاصل ہے جو یوں ہے۔

اے دیکھنے والی آنکھ جو کربلا میں موجود تھی اور جانکاہ منظر کو دیکھ ہی رہی تھی۔ اے کربلا میں موجود شخص جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا تو نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح میرا شیر بیٹا ابوالفضل سامنے سے اور اس کے دوسرے بھائی عقب سے گروہ اشقیاء پر حملہ آور ہوئے۔اے جنگ کربلا کے شاہد مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جس کے صحیح یا غلط ہونے کا مجھے علم نہیں۔تو مجھے بتا کہ کیا وہ صحیح ہے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ جس وقت میرے نورنظر کے دونوں بازو قلم ہو چکے تو ظالموں نے اس کے سر پر آہنی گرز مارا۔کیا یہ صحیح ہے۔

اے ابوالفضل اے میرے لخت جگر میں خوب جانتی ہوں کہ تیرے بازو سلامت رہتے تو دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا بہادر تیرا سامنا نہ کرسکتا۔ یہ سارا ظلم تم پر صرف اس وجہ سے ہوا کہ تمہارے بازو قلم ہو چکے تھے۔

ولاحول ولاقوة الا بالله العلی العظیم وصلی الله تعالیٰ علی محمد واله الطیبین الطاهرین المعصومین۔

مجلس سوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدلله رب العالمین باری الخلائق اجمعین والصلوٰۃ والسلام علی عبدالله ورسوله وحبیبه وصفیه سیدنا ومولانا ونبینا ابی القاسم المصطفیٰ محمد وعلیٰ اٰله الطاهرین المعصومین۔

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّیۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِیَةً ۚ یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِهٖ ۚ [1]

صلوٰت ہو نبی اور ان کی آل پاک پر۔

تحریفات واقعہ کربلا کے بارے میں شب اول کی بحث میں عرض کیا گیا کہ تحریف کی دو قسمیں ہیں ایک تحریف لفظی یا ظاہری ہوتی ہے جس میں الفاظ کو بدل دیا جاتا ہے اور دوسری معنوی کہلاتی ہے جو کلام کی روح کو بدل دیتی ہے۔ یہ بھی عرض کیا گیا کہ کربلا کی عظیم تاریخ جو ہمارے پاس ہے۔لفظی تحریف سے بھی دو چار ہوئی ہے یعنی ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے متن کی اتنی حاشیہ آرائی کی ہے کہ اس سے اس

[1] سور المائدہ:۱۳

کا پرنور وتابناک چہرہ تاریک ہو گیا ہے اور زیب داستان کے لئے ہم نے اس میں جو اضافے کیے تھے۔ انہوں نے بدنما داغ بن کر اسے مسخ کر دیا ہے۔ اس ضمن میں متعدد مثالیں آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ اور معنوی تحریف کا بھی شکار ہوئی ہے جو تحریف لفظی سے صدہا گناہ خطرناک ہے اور آج یہ جو ہم محسوس کر رہے ہیں کہ عظمت انسانی کا یہ شاہکار واقعہ اپنی تاثیر وافادیت کھو چکا ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہی تحریف معنوی ہے۔

تحریف معنوی کیا ہے؟

یہ تحریف لفظی سے اس معنی میں مختلف ہے کہ اس میں الفاظ یا متن کلام میں کوئی تبدیلی یا کمی بیشی نہیں کی جاتی بلکہ متن کلام کی توجیہ وتفسیر اس طریقے سے کی جاتی ہے کہ الفاظ کے معانی نہ صرف بدل جاتے ہیں بلکہ متکلم کی مراد سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ میں ایک مثال سے اپنا مطلب آپ پر واضح کرتا ہوں۔

اہل سنت کے معتبر ترین مجموعہ حدیث ''صحیح بخاری'' میں مسلم و مستند ترین ذرائع سے منقول ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت صحابہ ایک ایک اینٹ لیکن عمار یاسر دو دو اینٹیں اٹھا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انہیں دیکھا تو ان کے بدن سے مٹی جھاڑتے ہوئے فرمایا: ویح عمار تقتله فئة باغيه (افسوس ہے کہ عمار کو باغی لوگ قتل کریں گے۔)

حضور علیہ السلام کا اشارہ آیہ مبارکہ سورہ حجرات۔

وَاِنۡ طَآٮِٕفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا‌ ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ‌ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ

وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ۝۹ [1]

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں قتال پر اتر آئیں تو ان میں صلح کرا دو لیکن اگر ایک فریق زیادتی اور جارحیت پر مصر ہو تو اس سے اس وقت تک قتال کرو جب تک کہ وہ امر خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دے اور جب وہ سیدھی راہ پر آ جائے تو دونوں میں پورے عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرا دو کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عمار کے بارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جملے نے ان کی عظمت شان میں بہت اضافہ کیا۔ وہ جنگ صفین میں علی علیہ السلام کے لشکر میں نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے اور بہت سے ضعیف الایمان صحابہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ علی علیہ السلام اور معاویہ بن ابی سفیان میں سے کون حق پر ہے جس کا جھوٹے کے خلاف ساتھ دیا جائے۔

لیکن جب عمار شہید ہو گئے تو ایک بار تو سب پکار اٹھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان سچا ثابت ہوا اور روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ نبی علیہ السلام کے ارشاد میں باغی گروہ سے مراد معاویہ اور اس کے لشکری ہیں جو امام برحق علی علیہ السلام کے خلاف برسر پیکار ہیں ساتھ ہی ساتھ معاویہ کے سپاہیوں کو بھی سمجھ آ گئی کہ نص قرآنی اور ارشاد نبوی کی رو سے حمایت کے حقدار علی علیہ السلام ہیں نہ کہ معاویہ اور وہ اپنے کیے پر نادم ہو کر معاویہ سے برگشتہ ہونے لگے اس صورت حال نے معاویہ کے لشکر میں اضطراب کی لہر دوڑا دی لیکن معاویہ نے جس کا دین وایمان اور اوڑھنا بچھونا ہی مکر و فریب اور حیلہ بازی تھا تحریف معنوی کے ذریعے اپنی بگڑی بنانے کی کوشش کی۔ کیونکہ نہ تو ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متن کو بدلنا اس کے بس کی بات تھی اور نہ ہی اس سے انکار ممکن تھا جسے خود

[1] سور الحجرات:۹

اس کے لشکر میں موجود کم و بیش ۱۵۰۰ اشخاص نے اپنے کانوں سے زبان نبوی ﷺ سے سنا تھا۔

چنانچہ جب ان سب نے یک زبان ہو کر اسے اپنی گمراہی کا ذمہ دار قرار دیا تو اس نے کہا: نبی ﷺ کا ارشاد قطعاً درست ہے اور عمار کو واقعی گمراہوں کی جماعت نے قتل کیا ہے لیکن وہ گمراہوں کی جماعت ہم نہیں ہیں بلکہ علیؑ اور ان کے ہوا خواہ ہیں جنہوں نے عمار کو قتل ہونے کے لئے ہماری تلواروں کے حوالے کیا اور ان کے قتل کے اسباب فراہم کئے۔ اس طرح اس نے عمرو عاص کے تعاون سے سب کو راضی کر کے واپس لشکر میں بھیج دیا۔

عبداللہ بن عمرو عاص

عمرو عاص کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک تو اسی کا ہم سیرت تھا لیکن دوسرا نسبتاً بہتر اور باایمان تھا اور اس کا نام عبداللہ تھا۔

ایک دن معاویہ کی ایک محفل میں جہاں عبداللہ بھی موجود تھا۔ صفین والی مغالطہ بازی کی بات چل نکلی۔ حاضرین معاویہ کو حق پر ماننے پر مصر تھے۔ عبداللہ نے کہا: تمہارا مطلب یہ ہے کہ چونکہ عمار علیؑ کے لشکر میں تھے اس لئے انہیں قتل بھی انہیؑ نے کیا؟ سب نے جواب دیا ہاں یہی بات ہے۔ تو عبداللہ نے کہا: اس طرح تو سید الشہداء جناب حمزہؑ کو بھی انہی نے قتل کیا کیونکہ وہ آپ ﷺ کے لشکر میں تھے۔ معاویہ کو عبداللہ کی بات بہت ناگوار گزری وہ عمرو عاص سے مخاطب ہو کر بولا اس گستاخ کی زبان کو لگام کیوں نہیں دیتے؟ یہ تحریف معنوی کی ایک مثال میں نے پیش کی ہے۔

واقعات میں تحریف کیسے کی جائے کیونکہ ایک طرف تو ان واقعات کے کچھ عوامل و محرکات ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان کے معین مقاصد ہوتے ہیں۔

اسباب تحریف

کسی تاریخی واقعہ میں تحریف اس طرح سے ہوتی ہے کہ یا تو اس کے محرکات کی حقیقت بدل دی جاتی ہے یا اس کے اہداف کو توڑ مروڑ کے پیش کیا جاتا ہے۔ایک چھوٹی سی مثال ملاحظہ ہو۔

ایک شخص مکہ سے آیا ہے آپ اس سے ملنے کے لئے اس کے گھر جاتے ہیں محرک اس کا حاجی کی زیارت کی خواہش ہے کیونکہ یہ ایک مستحب عمل ہے۔لیکن دوسرا ایک شخص آپ کے جانے کو کسی خاص مقصد پر محمول کرتا ہے مثلاً کہ آپ بددیانتی یا خود غرضی سے وہاں گئے تھے۔آپ کا مقصد زیارت یا ثواب نہیں بلکہ کوئی لالچ ہے جس نے آپ کو اس عمل پر اکسایا ہے اور حاجی کی زیارت محض ایک بہانہ ہے۔اسے تحریف معنوی کہتے ہیں عاشورا کے تاریخی حادثے میں جس کے قوی محرکات بھی ہیں اور بلند اہداف بھی ہم مسلمانوں نے شیعیان حسین ابن علی نے جی بھر کے تحریفیں کی ہیں اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو معاویہ نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا تھا۔یعنی حسین علیہ السلام کے قیام کا ایک واضح محرک تھا لیکن ہم نے اسے نظر انداز کر کے ایک نیا محرک ان کے قیام کا تراش لیا ہے۔اس قیام کا ایک بہت ہی مقدس ہدف تھا لیکن ہم نے اسے بھی تسلیم نہ کیا اور اس کے بجائے اپنی مرضی کا ہدف گھڑ لیا آپ علیہ السلام نے ایک انقلاب برپا کیا۔ایک عظیم ومقدس انقلاب جس میں عظمت وتقدس کی تمام شرائط بدرجہ اتم موجود تھیں اور جو ایک ایسا غیر معمولی اور فوق العادت انقلاب تھا کہ دنیا جس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اس کے عظمت وتقدس کی وہ شرائط کیا تھیں۔؟

ہر وہ انقلاب جو مقدس ہو اس کی شرط اول یہ ہے کہ اس کے اہداف شخصی نہ ہوں بعض اوقات کسی کا انقلاب ذاتی اغراض کی خاطر ہوتا ہے۔لیکن بعض اوقات ایک شخص واحد اصلاح معاشرہ احیائے اقدار انسانی اعلائی کلمہ حق توحید الٰہی عدالت

اجتماعی اور مساوات جیسے عظیم مقاصد کی خاطر انقلاب برپا کرتا ہے اور اس وقت وہ محض فرد واحد نہیں بلکہ پوری انسانیت کا نمائندہ ہوتا ہے۔

اسی لئے وہ لوگ جن کے اعمال و افعال اور تحریکات و انقلابات اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ پوری نوع بشر کی بہبود حق و عدالت ومساوات کے قیام اور توحید خداشناسی اور ایمان کی تبلیغ کے لئے ہوتے ہیں ساری دنیائے انسانیت کے محبوب ہوتے ہیں اور ہر شخص ان سے اتحاد و یگانگت کا وہی رشتہ جوڑنے کا تمنائی ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے انسانوں کے سید وسردار جناب امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ''**حسین منی وانا من الحسین**'' کے الفاظ سے قائم فرمایا تھا ہم بھی اس مقدس تعلق کے شرف سے سرفراز ہونے کی تمنا میں کہتے ہیں ''**حسین منا ونحن من الحسین**'' کیونکہ حسین علیہ السلام نے چودہ سو سال پہلے ہماری اور سارے عالم انسانی کی فلاح ونجات کی خاطر قیام فرمایا تھا۔ ایک مقدس و پاکیزہ قیام جو ذاتی اور شخصی اغراض کی تمام آلائیشوں سے مبرہ تھا۔

قیام مقدس کی دوسری شرط

قیام مقدس کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ پوری دور اندیشی مکمل ادراک اور گہری اور وسیع بصیرت کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو یہ امر واقع ہے کہ بعض اوقات جب انسان پر ایسا وقت آتا ہے کہ وہ اجتماعی طور پر غفلت بےخبری نافہمی اور جہالت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔تو معاشرے میں ایک صاحب فہم وادراک اور اہل علم وبصیرت فرد ظاہر ہوتا ہے جو لوگوں کے مصائب ومصاعب کو خود ان سے صدہا مرتبہ بہتر طور پر سمجھتا ہے اور ان کے دکھوں کے علاج کی بھی پوری لیاقت وصلاحیت رکھتا ہے اور ایسے وقت میں کہ جب معاشرہ فہم و ادراک کی تمام صلاحیتیں کھو چکا ہوتا ہے اور حقائق کے وہ عکس جنہیں لوگ آئینے میں بھی نہیں دیکھ سکتے وہ پتھروں اور کچی اینٹوں میں دیکھ لیتا ہے وہ قیام کرتا ہے اور انقلاب برپا کرتا ہے۔ اسی طرح کا ایک عظیم انسان چالیس پچاس سال پہلے اٹھا تھا

جس نے ایک تحریک کی بنیاد رکھی اور ایک مقدس انقلاب برپا کیا جس کے اہداف و مقاصد نہایت ارفع و اعلیٰ اور پاکیزہ تھے لیکن ہمارے بزرگ اس زمانے میں اس کی حقیقی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔

وہ عظیم انسان سید جمال الدین اسد آبادی تھے جنہوں نے آج سے ساٹھ یا ستر سال پیشتر تحریک مشروطیت سے ۱۴سال پہلے قیام کیا اور اسلامی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا۔ ان کی وفات ۱۳۱۰ھ میں ہوئی۔ جب ہم اس مرد عظیم کی تاریخ حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی اس معاشرے میں اجنبی تھے اور اس بھری پری دنیا میں تنہا تھے۔ انہیں اس امت کے مرض کا پورا ادراک و احساس تھا جب کہ خود ملت اسلامیہ اس سے غافل تھی چنانچہ لوگ ان کی باتوں پر ناک بھوں چڑھاتے ان کا منہ چڑاتے اور نہ صرف ان سے تعاون نہ کرتے بلکہ انہیں تمسخر و استہزاء کا نشانہ بناتے تھے۔ آج اس واقعہ کو ساٹھ ستر سال گزر گئے ہیں اور اگرچہ تاریخ روز بروز وقت کی تہوں میں روپوش ہوتی جا رہی ہے لیکن عنقریب جب انسان کا شعور بیدار ہوگا اور اس کی نظریں ان تہوں میں دبے ہوئے حقائق کا مشاہدہ کریں گی تو معلوم ہوگا کہ وہ اس زمانے میں آنے والے دور کی ایک واضح تصویر دیکھ رہے تھے اور وہ کچھ جانتے اور سمجھتے تھے کہ ۹۹ فیصد مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

آپ کم از کم اس مرد عظیم کے دو خط۔ ایک مرحوم آیت اللہ میرزا شیرازی کے نام اور دوسرا جو بمضمون واحد اصفہان اور شیراز وغیرہ کے علما کو لکھا گیا۔ پڑھیں تو آپ کو ان کے فہم و ادراک کی وسعتوں کا اندازہ ہوگا اور پتہ چلے گا کہ استعمار کی گھناؤنی سیاست اور اس کے شیطانی ہتھکنڈوں کا انہیں کتنا علم تھا اور ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کی انہیں کتنی دھن تھی ان واہیات و خرافات کو چھوڑیے جو استعمار کے گماشتے آج تک بکتے ہیں ان کا انقلاب مقدس تھا اور وہ ظاہری سیاست کے پس پردہ ان تلخ حقائق کا مشاہدہ کر رہے تھے جن کا فہم و ادراک ان کے ہمعصروں کو نصیب نہ تھا۔

حسینی انقلاب بھی اسی طرح کا انقلاب تھا جسے اگرچہ اس کے وقوع کے وقت نہ سمجھا گیا لیکن آج اسے ہم خوب سمجھ رہے ہیں اور ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ یزیدیت کا مطمع نظر کیا تھا یزید کی حکومت کے کیا ارادے تھے معاویہ کا کردار اس میں کیا تھا امویوں کے منصوبے کیا تھے یہ سب کچھ اس وقت کے ۹۹ فیصد مسلمان نہیں سمجھتے تھے اس کی ایک بڑی وجہ ذرائع ابلاغ کا نہ ہونا تھا حتیٰ کہ خود مدینے کے باشندوں کو بھی کچھ معلوم نہ تھا لیکن جب انہیں یزید کی اصیلت کا پتہ چلا اور اس کی نام نہاد خلافت کے سیاہ و مذموم کارناموں کا انہیں علم ہوا خصوصاً جب انہیں اطلاع ملی کہ حسین علیہ السلام کو اس نے شہید کروا دیا ہے تو ان کے ذہن ہل گئے اور وہ سوچنے لگے کہ انہیں کیوں قتل کیا گیا ہے اور اس قتل کے پیچھے کیا محرکات و مقاصد کارفرما تھے۔ انہوں نے اشراف مدینہ پر مشتمل ایک وفد عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ کی سربراہی میں شام بھیجا۔ یہ لوگ جب شام پہنچے تو دمشق میں انہوں نے ایک مدت تک قیام کیا اور حالات معلوم کئے۔ جب مدینہ واپس آئے تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا خبر لائے ہو تو انہوں نے جواب دیا: شام میں قیام کے دوران ہمیں روز اندیشہ ہوتا کہ آسمان ہمارے سروں پر گر پڑے گا۔ لوگوں نے اس اندیشے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ جب بھی ہم یزید سے ملنے گئے تو تو اسے کھلم کھلا شراب خوری اور قمار بازی میں مصروف پایا۔ وہ کتوں اور بندروں سے کھیلتا اور محرمات سے زنا کرتا ہے۔ پھر اپنی راست گوئی کے اثبات میں عبداللہ بن حنظلہ نے جن کے آٹھ بیٹے تھے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: مدینے والو میں ایک چیز جانتا ہوں کہ تم یزید کے خلاف قیام کرو یا نہ کرو میں اور میرے آٹھ بیٹے ضرور ہی قیام کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عبداللہ نے اپنے آٹھوں بیٹوں کو اس مہم پر بھیجا جو سب کے سب شہید ہو گئے پھر عبداللہ خود بھی اس راہ میں شہید ہو گئے۔

یہ عبداللہ غسیل ملائکہ اس روز کہاں تھے جب حسین علیہ السلام مدینہ چھوڑ کے جا رہے تھے اور فرما رہے تھے؟

علی الاسلام السلام اذابلیت الامة براع مثل یزید

اب جبکہ امت اسلامی پر یزید جب حاکم مسلط ہو گیا ہے اسلام کا خدا ہی حافظ ہے۔

کیا دنیائے اسلام کی بیداری کے لئے حسین کی شہادت شرط ہے؟ کیا اس کے بغیر عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ اور مدینہ کوفہ اور دوسرے مقامات کے سینکڑوں مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھل سکتی تھیں؟ کیا حسین علیہ السلام کی حقانیت کا اثبات صرف ان کی شہادت ہی کے ذریعے ممکن تھا؟ کیا مذکورہ بالا جملے کی صداقت پر ایمان کربلا کے ساتھ مشروط تھا؟۔

انقلاب کے تقدس کی تیسری شرط

ایک مقدس انقلاب کی تیسری شرط یہ ہے کہ اپنی نوعیت میں بینظیر و بے مثال ہو۔ یعنی قیام کرنیوالا شخص ایسا انسان ہو جو باطل کی تاریکیوں سے بھاگے نہیں بلکہ ان سے بھڑ جائے اور نور بن کر ان میں اتر جائے۔ یہ نہ دیکھے کہ دنیا باطل کے تصرفات پر خاموش اور منقار ریز پر ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اور صورت حال یہ ہو کہ قیام کی تمام شرائط موجود ہونے کے باوجود لوگوں کی زبانیں قوت گویائی سے محروم ہوں۔ اور معاشرہ کی فضا پر گھمبیر تاریکی مکمل مایوسی حرکت ناپذیر سکون اور مطلق سکوت طاری ہو۔ ایسی حالت میں اللہ کا ایک بندہ میدان میں اترتا ہے اور تاریکیوں کو برق عزم سے مایوسیوں کو شعاع امید سے سکوت کو آواز حق سے اور سکون کو قوت عمل سے ختم کر کے ظلمات باطل میں انقلاب کے نورانی چراغ روشن کرتا ہے۔

کیا حسینی انقلاب ایسا ہی تھا یا نہیں؟ یقیناً ایسا ہی تھا۔ یقیناً ایسا ہی انقلاب حسین علیہ السلام نے برپا کیا تھا لیکن اس انقلاب سے آپ کا مقصد کیا تھا اور کیا ہدف آپ کے پیش نظر تھا۔؟

ہم کیوں کہتے ہیں کہ ایسے حسین علیہ السلام کی عزا اور ایسے کربلا کے ذکر کو تاابد زندہ رہنا چاہئے؟ حسین علیہ السلام اس انقلاب سے کیا چاہتے تھے؟ نیز آئمہ اطہار علیہم السلام نے کیوں اصرار کیا کہ عزائے حسین علیہ السلام زندہ رہے؟ اس حقیقت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے کیوں انقلاب برپا کیا؟ اس کے لئے ہمیں دلیل تراشی کی کیا ضرورت ہے؟ حسین علیہ السلام نے خود اپنے انقلاب کا منصوبہ ایک دوبار یا دس بار نہیں بلکہ بار بار بیان فرمایا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو ممکن ہے کہ دلیل تراشی کا کوئی جواز مل سکتا۔ ذرا یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے۔

انی ماخرجت شرا ولابطرا ولامفسدا ولاظالما انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی۔

میں کسی شرارت تکبر فساد یا ظلم کے ارادے سے نہیں نکلا۔ میرا واحد مقصد اپنے جد بزگوار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی اصلاح ہے۔

پوری صراحت سے فرماتے ہیں کہ دنیا مفاسد کی گرفت میں ہے میرے جد محترم کی امت بگڑ چکی ہے میرے قیام کا مقصد اس کی اصلاح ہے میں ایک اصلاح طلب انسان ہوں اور **اوید ان امر باالمعروف وانہی عن المنکر** (میرا مقصد امر بالمعروف اور نہی المنکر ہے) کے الفاظ سے آپ نے پوری وضاحت سے اپنے انقلاب کا مقصد بیان فرمایا ہے پھر فرماتے ہیں۔ **الا ترون الی الحق لا یعمل به والباطل لا تنہی عنه لیرقب المومن الی لقا اللہ** کیا آپ لوگ نہیں دیکھتے کہ حق پر کوئی عمل نہیں ہو رہا نہ ہی باطل سے نہی کی جارہی ہے۔ اب مومن کے لئے اپنے رب سے ملاقات کی تیاری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پس آپؑ نے خود بیان فرمایا ہے کہ میرا انقلاب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی غرض سے ہے میرا مقصد دین کا احیاء مفاسد کا خاتمہ اور اصلاح امت اسلامی ہے۔

قیام حسینی علیہ السلام کی تحریف

لیکن ہم نے آپؑ کے قیام کے مقاصد اور معانی بدل دیئے اور اس میں نہایت مہارت سے دو بہت بڑی تحریفیں کر ڈالیں۔

۱۔ کہ حسین علیہ السلام کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ شہید ہو کر امت کے گناہوں کا کفارہ کر دیں۔ تا کہ ہمارے گناہ بخش دیئے جائیں۔ ذرا ان سے پوچھا جائے کہ جناب یہ کہاں لکھا ہے اور کس سند سے آپ نے یہ بات کی ہے؟ کیا یہ الفاظ خود امام حسین علیہ السلام کے ہیں یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یا ائمہ اہل بیتؑ میں سے کسی کے؟ آخر کون ہے یہ الفاظ کہنے والا؟۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ہم نے مسیحیت سے لئے ہیں کیونکہ یہ انہی کا عقیدہ ہے کہ مسیح علیہ السلام مصلوب ہو کر ان کے گناہوں کا کفارہ بن گئے اور یہ نہ سوچا کہ یہ عقیدہ نہ اسلامی روح سے سازگار ہے نہ کلام امام علیہ السلام سے بلکہ خدا شاہد ہے کہ یہ آپؑ پر بہت بڑی تہمت اور انتہائی مذموم افتراء ہے خدا کی قسم ہے کہ اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں یہ الفاظ زبان پر لائے تو اس کا روزہ باطل ہو جائے گا۔

کیا امام علیہ السلام محض اس لئے گناہ کے خلاف ڈٹے تھے کہ گناہ گاران امت کے لئے مورچہ بن جائیں کیا آپؑ نے ہمارے لئے بیمہ کمپنی تیار کی ہے تا کہ ہمیں گناہوں کی سزا سے تحفظ مل جائے۔ جس کے عوض وہ ہم سے صرف چند نمائشی آنسوؤں کے طلبگار ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ بھی چاہیں بنیں ابن زیاد بنیں عمر سعد بنیں یا کچھ اور حسین علیہ السلام اس خیال سے کہ دنیا میں ابن زیادوں عمر سعدوں یا سنان بن انسوں کی کمی ہے ہمارا وجود ضرور برداشت کریں گے بلکہ اس کمی کو پورا کرنے کی ہماری مساعی جمیلہ کا خیر مقدم کریں گے اور ہمیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کریں گے۔

۲۔ کہ حسین علیہ السلام کی شہادت ایک خصوصی امر ہے اور ایسا امتیاز ہے جو صرف منصب امامت سے مخصوص ہے۔ محض برگزیدگان الٰہی ہی اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا عام مسلمان ایسے قیام پر مکلف نہیں کیونکہ یہ ان کی بساط اور اختیار سے باہر ہے اور نہ صرف یہ کہ عامتہ المسلمین سے یہ امر متعلق نہیں بلکہ اسلام کے عمومی دستور سے بھی مربوط نہیں۔ حالانکہ حسین علیہ السلام نے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ اسلام کسی مومن کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ مظالم و مفاسد کا خاموش تماشائی بنا رہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ پوری قوت سے اس کے خلاف ڈٹ جائے۔

امام حسین علیہ السلام نے ایک مکتب کی بنیاد رکھی۔ ایک عملی اسلامی مکتب کی بنیاد جس کی نظری تعلیم شریعت نے دی اور عملی جامہ اسے امام علیہ السلام نے پہنایا اور سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خود اس پر عمل کیا۔ لیکن جب ہم نے اسے مکتب ماننے سے انکار کر دیا اور اس کی تعلیمات کو برگزیدگان بارگاہ الٰہی سے مخصوص و مختص کر دیا تو پھر ہم ایسے امر کی پیروی اور اس پر عمل کرنے کی تکلیف سے آزاد ہو گئے اور جب پیروی یا عمل ہی ہمارے بس سے باہر ہو تو ہم حسین علیہ السلام اور ان کے مکتب سے کیسے استفادہ کر سکتے ہیں اور شہادت کی راہ پر ان کے نقش قدم پر چلنا ہمارے لئے کس طرح ممکن ہے اور پھر اس صورت میں واقعہ کربلا سے ہم کیا استفادہ کر سکتے ہیں؟ ہمارے اس طرز فکر اور انداز استدلال نے واقعہ کربلا کی افادیت کھو دی کیونکہ جب ہم نے کہا کہ یہ ایک خصوصی دستور ہے جو صرف حسین علیہ السلام یا ان کے ہم شان لوگوں کے لئے مخصوص ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ روضہ خوانی تو ٹھیک ہے کیوں کہ ہمارے بس کی بات ہے لیکن اسوہ حسینیؑ پر عمل صرف حسین علیہ السلام ہی جیسے لوگوں کا کام ہے۔ ہم کہاں اور ہماری بساط ہی کیا کہ اس کا تصور کر سکیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ امام مظلوم علیہ السلام کے ساتھ اس سے بھی بڑی کوئی خیانت ممکن ہے۔؟ کیا ان کے نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدائی مشن اور آفاقی تعلیمات کے ساتھ اس سے بڑی بھی کوئی غداری تصور میں آ سکتی ہے۔؟

یہ جو میں نے گزشتہ شب عرض کیا کہ کربلا کے واقعات میں ہونے والی معنوی تحریف اس کی لفظی تحریف سے صدہا گنا زیادہ خطرناک ہے مثلاً کسی کم عقل کا یہ دعویٰ کہ عاشور کا دن ۷۲ گھنٹے کا تھا یا حسین علیہ السلام نے اس دن تین لاکھ یزیدی فی النار کئے یا عاشور کے دن جناب قاسم کی عروسی انجام پذیر ہوئی؟ یا یہ صریح جھوٹ کہ روز عاشورا جعفر جن آپؑ کی مدد کو آیا یا کہ جب آپؑ کے تمام اعزا و انصار شہید ہو چکے تو آپ علیہ السلام نے جناب زینبؑ سے فرمایا کون ہے جو میرا گھوڑا لائے یہ لفظی تحریفات پر مبنی افسانے امام علیہ السلام کی کسر شان کا باعث تو ضرور ہیں لیکن آپؑ کے انقلاب کی روح اور اس کے اہداف کے لئے اتنے خطرناک نہیں جتنا خطرہ اسے تحریفات معنوی سے ہے۔

دراصل ہمارے ان افسوسناک تحریفاتی تصرفات نے قیام و انقلاب حسینی علیہ السلام کے خدوخال بدل کر نہ صرف اس کے اہداف و مقاصد پر کاری ضرب لگائی ہے بلکہ اسے ایسا مسخ کر دیا ہے کہ اس کی صحیح شناخت مشکل ہوگئی ہے۔

کہنے والے نے

اسلام کے دامن اور اس کے سوا کیا ہے
اک ضرب ید اللہیؑ سجدہ شبیریؑ

کہہ کر کتنی بڑی حقیقت بیان کی تھی۔ لیکن ہم نے ستم ظریفانہ تحریفات سے جہاں ضرب یداللہی کو دیو مالائی افسانہ بنا دیا وہاں سجدہ شبیری علیہ السلام کی افادیت بھی کھو دی۔

میں نے عرض کیا کہ آئمہ اطہار علیہم السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ تاکید روایت کی ہے کہ قیام و انقلاب حسینؑ کو زندہ رہنا چاہیئے اور اسے ہرگز فراموش نہ ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ مجالس عزا برپا کریں اور ان میں مصائب کربلا پر گریہ کریں۔ اس تاکید کا مقصد کیا ہے؟ اس سے کس ہدف کا حصول منظور ہے؟ اس کا

حقیقی ہدف تو وہی ہے جس کے پیش نظر آپ علیہ السلام نے عزائے حسین علیہ السلام کو زندہ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے اور جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔لیکن ایک ہدف اس کا جو ہم نے خود تراش لیا ہے اور جو اصلی ہدف کی مسخ شدہ شکل ہے۔

مسخ شدہ ہدف

یہ ہے کہ جناب زہرا صلوات اللہ علیہا کی تسلی خاطر اور دلاسا کا سامان کیا جائے۔ کیونکہ وہ ہم سے اپنے نور نظر کا پُرسا وصول کرنے کے لئے مجلس میں تشریف لاتی ہیں جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ آنجنابؑ اپنے فرزندؑ حبیب ومحترم کے ساتھ فردوس بریں میں رونق افروز رہیں جس کے اثبات میں خود سید الشہداء علیہ السلام کے مقدس الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں جو آپؑ نے ہنگام شہادت ارشاد فرمائے تھے کہ اب میں اس دنیا سے رخصت ہوتا ہوں تا کہ اپنے جد بزرگوار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے والد نامدار اور اپنی والدہ عالی وقارؑ کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔ اب باوجود اس کے کہ سیدہ کائنات جنت الفردوس میں اپنے نورعینؑ کے پاس موجود ہیں پھر بھی وہ ہمارے بے سروپا اور من گھڑت روضہ خوانیاں سن کر رونے کی غرض سے ہر مجلس میں تشریف لانے کے لئے بے تاب ہوتی ہیں تا کہ پرسا گزاریوں سے تسلی خاطر حاصل کر سکیں۔ کیا اس سے بڑی توہین بھی قابل تصور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی طرف سے انقلاب کربلا کو زندہ رکھنے کی جملہ تاکیدوں کا مقصد وحید صرف اتنا ہو کہ سیدہ کونین علیہا السلام اپنے نور العین کو جنت میں چھوڑ کر ہماری تراشیدہ اور توہین آمیز روضہ خوانیاں سماعت فرمانے کے لئے ہماری مجالس میں تشریف لائیں ہماری افسانہ سازیوں سے آپؑ کی تسلی خاطر تو کیا ہوتی ہو گی۔ ہاں سید الشہداء پر ایک نئے ظلم کے مشاہدے سے دلگیر ہو کر ضرور واپس جاتی ہوں گی؟

قیام حسینیؑ کو زندہ رکھنے کا ایک اور مقصد بھی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کربلا میں

ظالموں کی فوج کے ہاتھوں بے قصور شہید ہوئے یہ بہت بڑا المیہ ہے اور اس پر جتنا اظہار تاسف کیا جائے کم ہے۔لیکن روزانہ ہزاروں دوسرے بے قصور افراد کی جانیں بھی ظالموں کے ہاتھوں تلف ہوتی ہیں جو بذات خود ایک افسوسناک امر ہے لیکن کیا ان کی جانوں کا ضیاع بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ سال ہا سال قرن ہا قرن تک ان کا سوگ منایا اور ان کی مظلومیت کا ذکر کیا جائے؟ تو پھر امام علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود کیوں زندہ ہے جب کہ دنیا میں ہونے والے دوسرے قتل عام اپنے وقوع کے اثبات کے لئے تاریخ کی تحریری گواہی کے محتاج ہیں؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے حسین علیہ السلام کے مظلومانہ قتل میں ایک عظیم پیغام مضمر تھا حق وحقانیت کی زندگی کا پیغام۔

اس قتل نے حیات وموت اور فتح وشکست کے مروجہ مفاہیم بدل دیئے اسی لئے پیشوایان قوم نے اس قتل کو زندہ رکھنے کے تاکیدی احکام صادر فرمائے جب کہ دنیا میں واقع ہونے والے دوسرے مظلومانہ قتل بے پیغام ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ تاریخ کی ہمدردیاں ہی حاصل کر سکے۔اس زاویہ نگاہ سے حسین علیہ السلام کا خون ہرگز رائیگاں نہیں گیا بلکہ زندگی کا پیغام بن کر ابد تک تاریخ انسانیت کی پیشانی پر افشاں کی صورت دمکتا اور جگمگاتا رہے گا لیکن افسوس کہ ہم اس عظیم ترین حماسہ آفریں واقعے کو صرف رونے رلانے کا ذریعہ بنا کر اس کی افادیت ختم کرنے کے درپے ہیں۔

یاد رکھیے کہ دنیا میں واحد وہ مقتول جس کے خون کی ایک چھینٹ بھی ضائع نہیں ہوئی صرف کربلا کے ہیرو سید الشہداء حسین علیہ السلام ہیں۔تاریخ بشریت میں صرف ایک فرد جس کی شخصیت کے ایک ایک ذرے کی اہمیت کو دوست دشمن سب نے بلا امتیاز تسلیم کیا۔نورعین رسول الثقلین سبط اصغر جناب امام حسین علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں۔اور وہ انسان جس کے جسم مطہر سے بہتے ہوئے خون پر تا قیام قیامت خرچ ہونے والے اموال کا اگر حساب کیا جائے تو درست اندازے کے مطابق اس کے ایک ایک

قطرے پر خرچ ہونیوالی رقم کروڑوں اربوں روپوں تک پہنچے گی صرف نور دیدہ سیدہ کائنات ملکیۂ جنان جناب زہرا صلوات اللہ علیہا حسین علیہ السلام ہی ہیں۔ کیا اس فخر انسانیت شخص کے خون کو جس کے قتل نے صدیوں سے کاخ ظلم وستم اور قصر جور واستبداد میں زلزلہ مچا رکھا ہے کبھی ضیاع یا رائیگاں قرار دیا جا سکتا ہے؟۔

آج ہم روتے ہیں کہ حسین بن علی علیہ السلام کا خون کربلا میں ضائع ہوا لیکن نہیں جناب ان کا خون ہرگز ضائع نہیں ہوا۔ ہماری عقل ضائع ہوئی ہے جو ایسی باتیں کرتے ہیں حسین علیہ السلام کے خون کے ضائع ہونے پر واویلا کرنے والوں کو اپنی عقل کے ضیاع پر ماتم کرنا چاہئے کیونکہ سید الشہداء علیہ الصلوٰۃ السلام تو بمصداق ان لك درجة عند الله لن تنال الا بالشهادة شہادت عظمیٰ کے ذریعے مرضات خداوندی کے بلند ترین درجات پر فائز ہوئے آپؑ نے شہادت کی آرزو کی تھی نہ کہ اپنی جان ضائع ہونے کی اور یہ جو ہم آج روتے اور افسوس کرتے ہیں کہ آپؑ کا خون مقدس کربلا کی زمین پر ضایع ہو گیا ایک بے بنیاد افسوس ناک اور قابل مذمت انداز فکر ہے۔

فتحیاب کون؟

بزرگان دین نے عزائے حسین علیہ السلام کو زندہ رکھنے کی وصیت کیوں کی؟ اس لئے کہ حسین علیہ السلام کا ایک واضح ومعین ہدف تھا اور آپؑ نے ایک مکتب کی بنا ڈالی۔ انہوں نے چاہا کہ یہ مکتب زندہ رہے کیونکہ یہ محض نظریاتی نہیں بلکہ خالصتاً عملی مکتب تھا جس کی نظیر دنیا میں موجود نہ تھی۔ اگر کوئی شخص حسین علیہ السلام جیسی عظیم کسی اور شخصیت کے وجود کی نشان دہی کر سکے تو اسے اس اعتراض کا بھی حق ہے کہ ہم کیوں ہر سال عزائے حسین علیہ السلام کی تجدید کرتے ہیں۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا شخص ہو جو دشت کربلا جیسی جگہ میں عاشورا جیسے جانکاہ حوادث سے گزرا ہو اور طہارت نفس ایمان کامل خداشناسی صبر ورضا مردانگی واستقامت اطمینان واعتماد ثبات واستقلال عزت وکرامت نفس حریت فکر وعمل اکرام آدمیت وشرافت اور احترام انسانیت جیسے خصائص

عالیہ اور صفات سامیہ کا مالک ہو تو پھر ہم سے پوچھئے کہ حسینؑ بن علیؑ کے ذکر کو ہم کیوں زندہ و پائندہ رکھنے پر مصر ہیں لیکن ان کی مثال نایاب اور نظیر ناپید ہے اسی لئے ہم ان کی روح کے پرتو کو اپنے ضمیر میں اتارنے کے لئے اپنے آنسوؤں سے اپنی بصیرت کی راہ کا خس و خاشاک دھوتے ہیں اور آپ کو بھی اس خوش گوار اور ایمان افروز تجربے کی مخلصانہ دعوت دیتے ہیں۔ میں نے اس رات بھی عرض کیا تھا کہ سرچشمہ **ولا** سے نکلے ہوئے پاکیزہ آنسو کا ایک قطرہ جو ہماری روح کو اس مردِ عظیم کی نورانی روح سے ہم آہنگ کر دے اور اس کی ہمت و شجاعت غیرت و مروت حریت و آزادی ایمان و یقین تقویٰ وطہارت توحید و معرفت کا صرف ایک ذرہ ہی ہمارے دلوں میں روشن کر سکے تو دنیا و مافیہا کے عوض بھی اس کا سودا مہنگا نہیں۔

لیکن صرف حسین علیہ السلام کے خون کے ضیاع کے افسوس میں اگر آپ بے ذوق و نامطلوب آنسوؤں کے دریا بھی بہا دیں تو سوائے اس کے کہ عقل سے خالی دماغ فطری رطوبت سے بھی خالی ہو جائے اور کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ عظمت و شخصیت حسین کے اثبات وابقا اور جذبہ اتباع حسین کے رسوخ و تقویت کے لئے جن اقدامات کی ہمارے بزرگوں نے ہمیں تاکید فرمائی ہے انہیں روبہ عمل لانے کی شرط اولین مروارید اشک عقیدت کی نذرانہ گزاری ہے جس کی ایک چھینٹ سے راہ سلوک سے تردد و تذبذب کا غبار چھٹ جاتا ہے لیکن وہ چھینٹ نام و نمود کی خاطر خرچ کئے ہوئے قارونی خزانوں کے عوض بھی خریدی نہیں جاسکتی۔

ذکر اہلبیتؑ رسول کو زندہ رکھنے کی ضرورت

کیا ہے اور اس کے فوائد کیا ہیں؟

پہلا اور بنیادی فائدہ تو اس کا یہی ہے کہ ان کا وجود خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی سب سے بڑی شہادت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمتوں کا آئینہ دار ہے اگر

ہم کہیں کہ فلاں مسلمان نے فلاں جنگ میں دشمنان اسلام کے خلاف بڑی شجاعت و شہامت کا مظاہرہ کیا تو یہ اتنا اثر آفریں نہ ہوگا جتنا یہ کہ فرزند رسول ﷺ نے ایسا کیا کیوں کہ ایک مسلمان زیادہ سے زیادہ تعلیمات رسول ﷺ کا عکس ثابت ہوسکتا ہے بڑے سے بڑے صحابی کا کردار زیادہ سے زیادہ مکتب کی کرامت کا آئینہ دار ہوسکتا ہے جب کہ فرزندؑ رسول ﷺ نے آداب فرزندی خود آغوش رسول ﷺ کے فیضان سے پائے ہوتے ہیں۔

علی علیہ السلام کو دیکھیے کوئی بھی اور انسان حضور ﷺ سے اتنا قریب نہیں رہا۔ ایمان باللہ و بالرسول میں بھی کوئی آپؑ جیسا نہیں۔ جان نثاری اور فدا کاری میں بھی کوئی ان کی عظمتوں کو چھو نہیں سکا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ قریب ترین عزیز ہونے کی وجہ سے رسول ﷺ کی سیرت کو انہوں نے اپنی ذات میں اتنا سمو لیا تھا کہ زبان نبوت ﷺ سے **علی مني وانامنه** کے اعزاز یاب ہوئے اور لسان وحی سے نفس رسول ﷺ ہونے کا افتخار حاصل کیا۔

اسی طرح حسین علیہ السلام کے خارق عادات کردار سے دراصل نبی ﷺ ہی کی عظمت کا اثبات ہوتا ہے بلکہ بمصداق **حسين مني وانامن الحسين** خود حضور علیہ السلام اوران کے عظیم آفاقی پیغام کو حیات نو ملتی ہے کربلا میں جب آپ علیہ السلام کے سراپا میں نبی ﷺ کی ذات کی جھلک نظر آتی ہے تو دنیا کو پتہ چلتا ہے کہ نبی علیہ السلام زندہ ہیں اور جب تک حسینیت دنیا میں زندہ ہے وہ بھی زندہ رہیں گے۔ حسینیت کیا ہے؟ کیا وہ ختم الرسل ﷺ کی تعلیمات کی تجسیم نہیں؟ کیا وہ حضور علیہ السلام کی رسالت کا تسلسل نہیں کہ ایک طرف دولت وثروت شوکت واقتدار آرام وراحت خوشی وخرمی اور سرداری و امارت ہے لیکن حق نہیں جب کہ دوسری طرف فقرومحرومی بے خانمانی مصائب وشدائد رنج و اندوہ اور بے کسی ودرماندگی ہے لیکن باطل کا اس میں دخل نہیں بالفاظ دیگر ایک طرف باطل کی طرف سے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں

ہاتھ پر چاند رکھ دینے کے خوش آئند وعدے ہیں اور دوسری طرف حق کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کا قلبی اور روحانی سرور ہے۔

دیکھا آپ نے تاریخ کس صحت و ضبط کے ساتھ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور حسین علیہ السلام کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے پچاس سال بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زندہ وموجود ہونا ثابت کر رہے ہیں اور دھن ایک ہی ہے کہ خواہ سب کچھ قربان ہو جائے سب کچھ لٹ جائے بھائی بیٹے عزیز انصار سب قتل ہو جائیں حرم مقدس اسیر ہو کر قید و بند اور شائد و آلام سے دوچار ہوں لیکن حق زندہ رہے حقیقت حقانیت سلامت رہے اسلام اپنی تمام اقدار عدالت کے ساتھ قائم ودائم رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پائندہ رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انامن الحسین کے الفاظ کی سچائی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ کیا حسین علیہ السلام کا باطل دنیوی عیش و راحت پر حق کی راہ میں مصائب و آلام کی زندگی کا اختیار کرنا اسی نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلان ہے۔

یاعم لووضعو الشمس فی یمینی والقمر فی یساری
علی ان اترك هذا الامر ،ما تر کته۔

چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں کہ میں اس امر کو چھوڑ دوں گا۔ کی بازگشت نہیں تھی؟ اور کیا اس سے انا من الحسین کی عملی تفسیر نہیں ہو رہی تھی؟

وہ باتیں جنہیں انسان زبان سے تو کہتا ہے لیکن جن پر عمل کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ حسینؑ ہمیشہ ان پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ ان کی روح اتنی شکست ناپذیر ہے کہ فنا کے ماحول میں جریدہ عالم پر اپنے بقا ودوام کا اعلان ثبت کر رہی ہے۔ جسم نازنین تلواروں سے کٹا پھٹا ہوا۔ بھالوں سے چھدا ہو اور تیروں سے چھلنی ہے دل اپنے پیاروں کے غم میں سیپارہ ہے لیکن چہرے کا مصحف مرضات خداوندی اور اطمینان کامل کے نور سے منور اور بقائے حبیب حقیقی کے پرکیف تصور کے ابدی سرور سے

ضیاپاش ہے اور اگرچہ ۳۲سالہ شبیہ حیدرؑ کرار ۱۸سالہ ہمشکل رسول مختار ۱۳سالہ یادگار برادر بزرگوار شش ماہ نور نظر شیر خوار اور دوسرے متعدد لخت ہائے جگر زار کے علاوہ شرف صحابیت نبوی ﷺ سے مشرف حفاظ قرآن جان نثار اور جملہ یاران و انصار وفا شعار ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے پروانہ وار قتل سے دوچار ہو چکے ہیں لیکن ہیبت کا یہ عالم ہے کہ تیس ہزار کی کیل کانٹے سے لیس شقاوت اور سنگدلی میں لاثانی سپاہ ستمگار سامنے سے اس طرح بھاگتی ہے جیسے شیر ژیاں کے سامنے سے گلہ ہای گرگان مکار۔

یہ عجیب عظیم انسان ہے کہ مصائب و آلام کی تمام ناقابل عبور حدود پار کر چکا ہے زمین کی وسعتیں اس کے گرد تنگ اور آسمان کی پہنائیاں اس پر تاریک ہو چکی ہیں۔ اپنا سب کچھ لٹا چکا ہے اور اب تھوڑی دیر میں خود بھی راہ خدا میں قربان ہوا چاہتا ہے پھر اپنی جان سے بھی کہیں زیادہ اپنے بعد اسے حرم پاک کی اسیری کا غم کھائے جا رہا ہے۔لیکن دین خداوندی کا چراغ جو صبح تک سنبھالے لے رہا تھا چاشت کے بعد سے روشن ہوتے ہوتے اب رشک خورشید کربلا بن گیا ہے جس کے منظر میں وہ ایسا کھویا ہوا ہے کہ یہ سارے مصائب اس کے سمند ذوق شہادت پر تازیانے برسا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کس لئے اس نے قبول کیا ہے اور یہ تباہی کس چیز کو بچانے کی خاطر اس کے منظور کی ہے؟ اور کیا وہ اسے بچانے میں کامیاب ہوا ہے۔؟ یہ اس کی ناقابل شکست روح سے پوچھنا چاہئے جو''**رب انجزت وعدی فاوف بعهدك**'' کے الفاظ میں اپنے خالق سے مصروف راز و نیاز ہے۔ اس کے عظیم باپ نے بھی سجدے کی حالت میں سر پر تلوار کا مہلک زخم کھا کر''**فزت ورب الكعبة**'' کے الفاظ سے کوئی وعدہ وفا کرنے کی روحانی مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔

کیا آپ کربلا کے علاوہ کسی جگہ میں فضائل انسانی کی اس معراج کا مشاہدہ ممکن سمجھتے ہیں؟ کیا عظمت انسانیت کا حامل ایسا کوئی واقعہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے جو

کربلا کی بجائے بیان کیا جا سکے؟اسی لئے اسے یاد رکھنے بار بار بیان کرنے ہر سال اس کی تجدید کر کے اسے زندہ رکھنے کی تاکید وارد ہوئی کیونکہ یہ ۷۲ خدا پرستوں کی ۳۰۰۰۰ طاغوت پرستوں پر ابدی روحانی فتح کی یاد دلا کر مستضعفین دنیا کو طاغوت کے خلاف قیام کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ باوجود اس کے کہ یہ صرف بہتر تھے اور ۳۰۰۰۰ کی مسلح سپاہ کے ہاتھوں ان کا قتل ہو جانا بھی قطعی تھا لیکن نہ صرف یہ کہ ان میں سے کسی نے بھی دشمن کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا اور اس کی طرف سے امان نامے کو پشت پائے استحقار سے ٹھکرا دیا بلکہ امام کی طرف سے اپنی جان بچا لینے کی پوری اجازت کے باوجود آپؑ کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا جب کہ سپاہ بے پناہ یزید سے تیس سپاہی اور ایک سردار اھر یمنی دل پر لعنت بھیج کر اس یزوانی جماعت میں ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جان دینے کے لئے آن ملے۔ کیا دنیا میں کوئی گھاٹے کا سودا بھی کرتا ہے؟ جیسے **فزت و رب الکعب** میں گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ جیسے۔

ان لم یستقم دین محمد الا بقتلی فی سیوف خذینی۔

احیاء واستقامت دین حق کے لئے خود کو تلواروں کے حوالے کرنا گھاٹے کا سودا نہیں تھا اسی طرح ان ۱۳۱ انسانوں کا دنیاوی مفادات پر شہادت فی سبیل اللہ کو اختیار کرنا بھی یقینا گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

حق تو یہ ہے کہ شکست عمر بن سعد نے کھائی۔ عقبیٰ تو کھوئی ہی تھی تیس جنگ جو کھو کر دنیا بھی کھوئی پھر پہلے تو کچھ دیر عرب کے دستور کے مطابق جنگ ایک مقابلے میں ایک اصول کے مطابق ہوتی رہی لیکن جب طاغوت کی سپاہ کو اس میں شکست ہوئی تو انہوں نے جنگ مغلوبہ شروع کر دی اور جب اس میں بھی حسینی علیہ السلام شیروں کے حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ہر محاذ پر منہ کی کھائی تو بزدلوں کو تیراندازی کی پناہ میں عافیت نظر آئی۔

جب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اصولی اور روحانی فتح کیسے حاصل ہوئی اور ابدی اخلاقی شکست فاش سے کون دو چار ہوا۔

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ

کا مخاطب کون بنا اور فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ کا مصداق کون ٹھہرا۔

دشمن بوکھلا گیا

پھر جب امام علیہ السلام خود میدان میں تشریف لائے تو کس عالم اور کس حالت میں آئے تھے ذرا روز عاشوراء کی اس عصر کا تصور کریں۔ کہ جس کی ظہر تک متعدد اصحاب جان نثار موجود تھے جن کے ساتھ آپؑ نے نماز بھی ادا فرمائی۔ صبح سے لے کر اب تک بڑی زحمت اٹھا چکے ہیں ہر صحابی کی لاش خیمہ شہدا تک اٹھا کے لے گئے ہیں۔ سب انصار جان نثار کی شہادت کے موقع پر ان کے سرہانے پہنچے ہیں خود رنج و اندوہ کا شکار ہیں لیکن اسی صد پارہ دل کے ساتھ اپنے رنجور وجگر افگار اہل بیتؑ کو بھی تسلی دے رہے ہیں اپنے جگر گوشوں کی لاشیں در خیمہ تک خود اٹھا کے لاتے رہے ہیں اور اتنی مشقتیں برداشت کر چکے ہیں کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے داغوں کو لے کر سب سے آخر میں میدان میں آتے ہیں۔ اشقیا سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں آپؑ کو زیر کر لینا کیا مشکل ہوگا۔ لیکن حملہ آوروں کے پرے کے پرے جب گاجر مولی کی طرح شیر خدا کے شیر کی تلوار سے کٹنے شروع ہوتے ہیں تو عمر سعد پکارتا ہے۔ بزدلو! جانتے ہو کس کے مقابلے میں آ گئے ہو؟ هذا ابن قتال العرب یہ عرب کے عظیم ترین شمشیر زن شہسوار علی بن ابی طالبؑ کے لخت جگر ہیں۔ خدا کی قسم اس کے بدن میں علی علیہ السلام کی روح کارفرما ہے اس سے جنگ کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔

کیا یہ شکست کی واضح علامت نہیں ہے؟

پھر پورے تیس ہزار مسلح جنگجو ایک تن تنہا مصائب و آلام میں مبتلا دل ریش تھکے ہارے اور بھوکے پیاسے پردیسی کے سامنے سے ایسے بھاگیں جیسے بھیڑیے

سے بھاگتی ہیں تو شجاعت و مردانگی اور میدانی جنگ کے حوالے سے بھی شکست کیسے ہوئی؟

امام کے عجیب خطبے

نہ صرف یہ کہ لشکر یزید امام علیہ السلام کی شمشیر بے امان کی تاب نہ لا سکا بلکہ آپؑ کی گفتگو کے سامنے بھی نہ جم سکا۔ آپؑ نے روز عاشورا جو چند خطبے ارشاد فرمائے عربی ادب میں متفقہ طور پر فن خطابت کے عظیم ترین شاہکار شمار ہوتے ہیں۔ اہل سخن خوب جانتے ہیں کہ کلام کے انتہائی موثر ہونے کے لئے یہ لازمی ہے کہ متکلم موقعہ کی مناسبت سے ایک خاص کیفیت میں ہو۔ عام حالت میں انسان اعلی معیار کی اثر انگیز اور تاثر خیز گفتگو نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ اس کی روح ایک خاص کیفیت میں ہو جس میں تاثیر کی جملہ شرائط بدرجہ اتم موجود ہوں مثلاً اگر وہ مرثیہ کہنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ذہن پوری طرح سے موضوع مرثیہ کی دردناکی کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اس کا دل سوز و درد میں ڈوبا ہوا ہو۔ اگر کوئی غزل کہنا چاہے تو اس کے لئے قومی احساسات عشق میں غرق ہونا لازمی شرط ہے اور اگر کوئی رزمیہ نظم کہنا چاہے تو شجاعت و مردانگی کے حقیقی شعور و احساس کی اس میں صلاحیت بہت ضروری ہے۔

اب سید الشہداؑ کے خطبات عاشورا کا مطالعہ کیجئے۔ ہنگام خطاب آپؑ گھوڑے سے اتر کر اونٹ پر سوار ہو جاتے ہیں تا کہ بلند تر مقام پر ہونے کی وجہ سے آپؑ کی آواز بہتر سنی جا سکے اور یوں گویا ہوتے ہیں۔ تبا لکم ایھا الجماعۃ۔

یہ خطبہ فصاحت و بلاغت میں سو فیصدی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے خطبہ ہای جلیلہ کا نمونہ ہے اس حقیقت سے قطع نظر کر کے بھی دیکھیں تو اس سے شیریں اور موثر تر کلام عربی ادب میں موجود نہیں۔ آپؑ نے صرف ایک دو بار ہی خطاب فرمایا لیکن اس سے عمر بن سعد کی جان پر بن آئی اور وہ ایسا حواس باختہ اور خوف زدہ ہوا کہ گورنری کے سرکاری وعدے اس کی نظروں میں سراب بن گئے اور اپنا مستقبل اسے

اپنے اعمال سے بھی زیادہ سیاہ اور تاریک نظر آنے لگا۔ اسے یہ جان لیوا اندیشہ لاحق ہو گیا کہ امام کے خطبے کے اثر سے اس کے سپاہی باغی ہو جائیں گے۔ دوسری بار جب پھر امام علیہ السلام نے خطبہ شروع فرمایا تو نامردی کی انتہا دیکھیے اور اندازہ کیجئے کہ وہ لوگ روحانی طور پر کتنے شکست خوردہ ہو چکے تھے۔ عمر بن سعد نے امام علیہ السلام کے خطبے پر چیخنے اور شور مچانے کا حکم دیا تا کہ وہ لوگ حسین علیہ السلام کی آواز نہ سن سکیں۔ کیا یہ شکست کی واضح علامت نہیں ہے؟ مکمل طور پر شکست فاش کی؟ اور کیا یہی علامت فتح امام علیہ السلام کی بھی نہیں ہے؟

کیا ہمیں اس سے یہ سبق نہیں لینا چاہئے کہ اگر انسان صاحب ایمان ہو۔ توحید پر یقین رکھتا ہو۔ آخرت پر اس کا عقیدہ پختہ ہو اور نفس مطمئنہ رکھتا ہو تو تن تنہا ۲۰ ہزار ۳۰ ہزار کی سپاہ اشرار کو روحانی اخلاقی جسمانی ہر محاذ پر شکست دے سکتا ہے۔

اس عظیم انسان کی مثال دنیا میں کہاں موجود ہے؟ کون شخص عظمت انسانیت کے اس معیار پر پورا اتر سکتا ہے کہ حسین علیہ السلام کے خطبے جیسا ایک جملہ ہی ادا کر سکے۔ یا کربلا کی عظیم و دل افگار خاتون جناب زینبؑ ہی کے خطبے جیسا ایک جملہ بول سکے؟

یہ مدرسہ کربلا کے درس ہیں اور عزائے حسینؑ کو زندہ رکھنے کی تاکید کا حقیقی مقصد ان تعلیمات کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ہے تاکہ حسینؑ کی عظمت کا اندازہ ہو سکے تاکہ عزائے حسین علیہ السلام میں ہونے والی اشک ریزی پورے شعور اور پوری معرفت سے ہو حسین علیہ السلام کی یہ معرفت آپؑ کے قلب وضمیر کو رفعت اور آپ کی انسانیت کو جلا دے گی۔ آپ کو ذہنی غلامی سے نجات دے کر نہ صرف حق گو اور آزاد انسان بلکہ سچا مسلمان بنائے گی۔ مکتب حسین انسان سازی کا مکتب ہے۔ گنہگار سازی کا نہیں۔ حسین کا محاذ عمل صالح کا محاذ ہے۔ گناہ کا نہیں۔

بس عزائے حسینؑ کو زندہ رکھنے کی ضرورت میں یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ کسی بھی کڑی سے کڑی آزمائش کے سامنے افراد امت اسلامیہ کا اعتماد نفس متزلزل نہ ہو غور

کریں کہ آپؑ پر مصائب و آلام کے کون کون سے کوہ گراں نہیں ٹوٹے؟ کون کون سے دکھ درد سے آپؑ دو چار نہیں ہوئے؟ کس کس ابتلا کا آپؑ نے مقابلہ نہیں کیا؟ اور کون کون سے بڑے سے بڑے داغ آپؑ نے اپنے دل صد پارہ پر نہیں لئے؟ لیکن کیا آپ کے پائے صبر و ثبات اور عزم و استقلال میں ذرہ بھر بھی کوئی لغزش تزلزل یا اضمحلال واقع ہوا۔؟ کیا آپؑ ان انتہائی کڑی آزمائشوں پر انتہائی خوبی و خوش اسلوبی سے پورے نہیں اترے؟ کیا آپؑ نے احیاء دین حق کا فریضہ بطور احسن انجام نہیں دیا؟ اور کیا آپؑ اپنے جد بزرگوار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے ہوئے وعدے سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہوئے؟

آپ لمحہ بھر کے لئے ان کے سچے شیعہ تو بن جایئے۔ ذرا ان کی پیروی تو کر کے دیکھئے ان کے توحید اور آخرت پر ایمان کی قوت کا مشاہدہ تو کیجئے۔ پھر آپ کو ان کی عظمتوں کی معراج کا اندازہ ہوگا۔

صبح عاشورا کو آپؑ نے ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا کہ شاید اس وقت سامعین کو اس کی حقیقت و صداقت کا اندازہ نہ ہوا ہو۔ لکھا ہے کہ نماز فجر کے بعد آپؑ نے اصحاب باصفا سے مخاطب ہو کر فرمایا ''عزیز دوستو'' اب تیار ہو جاؤ اور یاد رکھو کہ موت کی حیثیت صرف ایک پل کی ہے جس پر سے گزر کر ہم اس دنیا سے دوسری دنیا کی طرف جاتے ہیں۔ ایک بہت دشوار پرخطر لیکن نہایت کم اہمیت اور کثیف دنیا سے ایک انتہائی پرعظمت و اہمیت پرکیف و مسرت اور نہایت باعزت و شرف لطیف دنیا کی طرف! یہ تو آپؑ کا قول تھا جسے حاضرین نے بھی سنا وقائع نگاروں نے بھی لکھا اور تاریخ نے بھی اپنوں اور بیگانوں کی روایت سے قلم بند کیا۔ لیکن آپ کا عمل ملاحظہ ہو کر لشکر عمر سعد کے وقائع نگار حمید بن مسلم کا بیان ہے۔

''مجھے سخت تعجب ہے حسینؑ بن علیؑ پر کہ جوں جوں ان کی شہادت کا وقت قریب آتا جا رہا اور ان کے مصائب کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے آپؑ کا چہرہ کسی داخلی مسرت سے اس طرح کھلتا اور روشن ہوتا جا رہا ہے کہ گویا بڑے طویل فراق کے بعد

وصل حبیب سے بہرہ ور ہوا ہی چاہتے ہیں'' آخر میں وہ کہتا ہے۔

''دم آخر جب میں حسینؑ کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ سراقدس جسد مطہر سے قلم کیا جا چکا ہے لیکن جب میری نظر آپؑ کے چہرے پر پڑی تو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس قدر نور آپؑ کے روئے مقدس سے پھوٹ رہا تھا کہ میں دم بخود وارفتگی کے عالم میں بھول ہی گیا کہ میں ایک شہید کو دیکھ رہا ہوں جس کا سر مبارک جسم پاک سے جدا ہو چکا ہے اور جو موت کے پل پر سے گزر کر اس دنیائے فانی سے عالم بالا کو سدھار چکا ہے''

کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسی مثال ہے؟ کوئی ایسا نمونہ ہے جس کی یاد کی وقتاً فوقتاً تجدید تعمیر اخلاق انسانی اور احیائے اقدار آدمیت کے لئے ایک تاریخی ضرورت ہو۔

دشمن پر آپ کے حملوں کے بارے میں تاریخ کا بیان ہے کہ آپؑ نے میدان میں جس مقام کو اپنے حملے کا مرکز قرار دیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیام سے زیادہ دور نہ رہا ہوگا کیونکہ؟

اولاً یہ کہ آپ لشکر عمر سعد کی نامردی اور ناانسانیت کا پورا اندازہ کر چکے تھے اور ان سے یہ توقع قطعاً فضول تھی کہ یہ سوچیں کہ جنگ تو ہماری حسینؑ سے ہے۔ حرم حسینؑ سے ہمارا کیا واسطہ؟ اور کہیں خیام حرم سے متعرض نہ ہوں۔ لہٰذا آپؑ نے چاہا کہ جب تک بدن میں جان اور رگوں میں خون باقی ہے کوئی خیام کی طرف بڑھنے کی جسارت نہ کرے۔ چنانچہ جب حملہ کرتے اور سپاہ یزید سامنے سے بھاگ کھڑی ہوتی تو ان کے تعاقب میں زیادہ دور تک نہ جاتے بلکہ تھوڑی ہی دور سے واپس آ جاتے کہ مبادا بزدل یزیدی خیمہ گاہ پر حملہ کر دیں۔

اور ثانیاً یہ کہ جب تک زندہ رہیں اہل بیت اطہار آپ کی زندگی سے باخبر رہیں لہٰذا آپؑ نے اپنے حملوں کا مرکز ایسے مقام کو بنایا تھا جہاں سے آپؑ کی آواز آپؑ

کے حرم اطہر تک پہنچ سکے۔ اسی لئے حملے اور تعاقب کے بعد جب واپس تشریف لاتے تو

لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم فرماتے تھے

جس سے اہل بیتؑ کو معلوم ہو جاتا کہ آپ ہنوز زندہ ہیں آپؑ نے انہیں تاکید کی ہوئی تھی کہ جب تک آپ علیہ السلام زندہ ہیں وہ خیموں سے باہر نہ آئیں۔

ان باتوں پر یقین نہ کریں کہ حرم پاک بے قرار ہو کر بار بار خیموں سے باہر نکل آتے تھے۔ ہرگز ایسا نہ تھا کیوں کہ امام علیہ السلام کی حکم عدولی کا نہ کوئی جواز تھا نہ امکان۔ علاوہ ازیں امام کا یہ حکم بھی تھا کہ جب تک میں زندہ رہوں سوءقول سے ہر قیمت پر احتراز کیا جائے تا کہ اجر میں کوئی کمی نہ واقع ہو جائے اور دشمنان دین کے عذاب میں اضافہ ہو۔ لہٰذا نہ امام کی حکم عدولی ہوئی نہ حرم محترم میں سے کوئی باہر نکلا اور نہ ان کی غیرت وحمیت ہی انہیں باہر آنے کی اجازت دیتی تھی۔

حرم جب امام علیہ السلام کی صدائے **لاحول** سنتے تھے تو انہیں تسکین سی ہو جاتی تھی کہ آپؑ زندہ ہیں حتیٰ کہ آپؑ ایک دوبار وداع کے بعد بھی خبر گیری کے لئے تشریف لائے اسی لئے شہادت واقع ہو جانے کے بعد بھی حرم آپؑ کے انتظار میں رہے۔ عربی گھوڑوں کو خاص جنگی تربیت دی جاتی تھی گھوڑا بہت سدھایا جا سکنے والا جانور ہے۔ میدان جنگ میں جب سوار قتل ہو جاتا تو اس کا گھوڑا شدید ردعمل کا مظاہرہ کرتا تھا۔

اہل بیت اطہار درخیمہ پر منتظر کھڑے تھے کہ شاید امام ابھی زندہ ہوں اور شاید ان کی آواز سنائی دے۔ شاید وہ ایک بار پھر خدا حافظی کے لئے تشریف لائیں اور اس طرح ان کی زیارت نصیب ہو جائے۔

اور جب گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ تو سب اس خیال سے کہ امام تشریف لائے ہیں درخیمہ پر جمع ہو گئے لیکن جب گھوڑے کی پشت پر سوار کی بجائے الٹی ہوئی زین پر نگاہ پڑی تو خاندان رسول نے **واحسینا وامحمدا** کی فریاد بلند کی سب گھوڑے کے گرد جمع ہو گئے۔

نوحہ سرائی انسان کی فطرت میں داخل ہے انسان اپنے درد دل کا اظہار نوحے سے کرتا ہے کبھی آسمان سے خطاب کرتا ہے کبھی زمین سے مخاطب ہوتا ہے کبھی اپنے آپ کو مخاطب قرار دیتا ہے لیکن یہاں اہل بیت امام مظلوم کے گھوڑے سے مخاطب تھے۔

امام عالی مقامؑ کا حکم تھا کہ میری زندگی میں نوحہ وبکا نہ کرنا لیکن اب آپ کی مظلومانہ شہادت پر سب سوگوار اور نوحہ کناں تھے۔

اصحاب مقاتل نے لکھا ہے کہ آپؑ کو اپنی ایک دختر سکینہؑ سے غیر معمولی محبت تھی۔ بڑی ہو کر یہ خاندان رسالت کی عظیم ترین عالمہ بنیں جن کا سب علماء و ادبائے عرب بڑا احترام کرتے تھے۔ امام علیہ السلام اس بچی کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ لکھا ہے کہ اس معصومہ نے شہادت امام مظلوم پر آپ علیہ السلام کے گھوڑے سے مخاطب ہو کر ایسی نوحہ سرائی کی کہ سننے والوں کے کلیجے شق ہوتے تھے۔ اس دل گداز اور جگر پاش نوحے کے الفاظ یوں تھے۔

یاجواد ابی ھل سقی ابی ام قتل عطشانا

اے میرے بابا کے گھوڑے۔ کیا میرے بابا کو پانی پلایا یا پیاسا ہی قتل کر دیا گیا۔

اے خدائے بزرگ و برتر ہمارے دلوں کو نور حقیقت سے روشن فرما۔ تحریف یا شیطان کی اکساہٹ کی وجہ جو گناہ ہم سے سرزد ہوئے ہیں انہیں معاف فرما ہمیں دین حق کی سچی تبلیغ کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرما اور ہماری عاقبت بخیر فرما۔

رحم اللہ من قرا الفاتحہ مع اصلوٰۃ

مجلس چہارم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدلله رب العالمين۔ بارى الخلائق اجمعين
والصلوٰة والسلام على عبدالله ورسوله و حبيبه
وصفيه سيدنا ومولانا ونبينا ابى القاسم المصطفى
محمدوآله الطيبين الطاهرين المعصومين

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ مِّیۡثَاقَہُمۡ لَعَنّٰہُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَہُمۡ قٰسِیَۃً ۚ یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِہٖ ۚ [1]

پچھلے ہفتے ہم نے عاشورا کے تاریخی واقعے میں تحریف کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی اور اسے چار ابواب میں تقسیم کیا۔

۱۔تحریف کا معنی اور اس کی جملہ اقسام
۲۔تحریفات واقعہ کربلا اور اس کی مثالیں۔
۳۔تحریفات واقعہ کربلا کے خصوصی عوامل وموجبات
۴۔تحریف اور ہماری ذمہ داریاں۔

---

[1] سور المائدہ:۱۳

پہلی تین قسموں پر ہم پچھلی مجالس میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔ آج کی مجلس میں ہم تحریف کے بارے میں عموماً مسلمین اور علماء امت کی ذمہ داریوں پر بحث کریں گے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس عظیم ترین تاریخی سانحہ میں یہ تحریفات وقت گزرنے کے ساتھ تدریجاً واقع ہوئی ہیں۔

لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ہم پر یہ فرض فرمان خداوندی اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رو سے بھی عائد ہوتا ہے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہ ہوگا لیکن قبل اس کے کہ میں اس بارے میں عوام مسلمین اور خواص امت یعنی علمائے کرام کے فرائض کو تعیین کروں دو باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔تحریف کا ذمہ دار کون؟

اس ضمن میں تاریخ کی روشنی میں پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ تحریف کی ذمہ داری عوام امت پر عائد ہوتی ہے یا علمائے امت پر؟ ماضی میں اسے وجود میں لانے والا کون تھا اور آج اس کا تدارک کون کرے اور کیسے کرے؟

علماء حضرات عام طور پر اس کا قصور وار عوام کو ٹھہراتے ہیں ان کے نزدیک یہ لوگ جاہل نادان نالائق حقائق نا آشنا اور حقائق ناپذیر ہوتے ہیں۔

مشہور قصہ ہے جسے میں نے آیت اللہ صدر اعلیٰ اللہ مقامہ سے سنا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں پہلے بھی کہیں اسے بیان کر چکا ہوں کہ ایک مولوی صاحب منبر پر الٹی سیدھی ہانک رہے تھے ان سے کسی نے اعتراضاً کہا: جناب چند لفظ معقول بھی کہہ دیجئے کیا فرق پڑتا ہے۔تو فرمانے لگے۔انہیں سمجھے گا کون؟ اور اپنے اس فرمودہ کے اثبات میں ایک دلیل بھی داغ دی اور اگرچہ عوام بھی عام علماء سے کچھ بہت کم ذہن نہیں

رکھتے کیونکہ اگر وہ ان کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی استدلالات سے باقاعدہ محفوظ ہوتے ہیں اور اسی چیز پر ان کی گرم بازاری کا انحصار ہے تو ظاہر ہے ان جیسی فصاحت وطلاقت نہ سہی لیکن لگ بھگ فہم تو ضرور ہی رکھتے ہوں گے۔

لیکن اکثر علماء حضرات اس منطق کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسے منطق ہی نہیں سمجھتے اور بدستور عوام کی ناسمجھی کا رونا روتے ہیں حالانکہ اگر یہی ناسمجھ لوگ نہ ہوں تو ان کی مجلسیں سونی ہو جائیں اور ان کی مارکیٹ ٹھنڈی پڑ جائے۔ اسی لئے تو مثل مشہور ہے مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے۔

علماء یقیناً سر ماہی کی حیثیت رکھتے ہیں جب کہ عوام جسم ماہی کی۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عوام قطعاً بے قصور ہیں۔ کیونکہ اگر وہ اہل منبر حضرات کے فلسفی اور منطقی مضامین کی پرکھ کا سلیقہ رکھتے ہیں تو منطقی ہی طور پر انہیں تحریف کا بھی کچھ نہ کچھ شعور ہونا چاہئے۔ لہٰذا ہم بجا طور پر تحریف کا ذمہ دار بیش وکم کی نسبت کے حوالے سے علماء اور عوام دونوں کو ٹھہرا سکتے ہیں۔

تحریف کے بارے میں علماء کا ذمہ دار اور قصوروار ہونا یقیناً کسی توضیح کا محتاج نہیں۔ لیکن کیا مذکورہ بالا استدلال کی بنا پر عوام اس میں برابر کے شریک ثابت نہیں ہوتے؟ بلکہ کیا وہ اپنی نجی محفلوں میں محرف واقعات کی تشہیر واشاعت سے کچھ زیادہ ہی مجرم ثابت نہیں ہوتے؟ اس ضمن میں ایک حدیث مبارک پیش کرتا ہوں جو علماء کے نزدیک بہت معتبر ہے۔

امام ششم علیہ السلام سے استفسار:

سورہ البقرہ کی آیہ مبارکہ:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ

(ان یہودیوں میں کچھ بے سواد ایسے ہیں جو کتاب خدا کے صرف وہی

مضامین سمجھ سکتے ہیں جو ان کے مطلب کے ہوتے ہیں) میں باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو بے سواد اور ان پڑھ قرار دیا ہے۔ آج کی اصطلاح میں انہیں عوام کا نام بھی دیا جا سکتا ہے پھر بھی انہیں اپنے علما کی تقلید کرنے پر قابل مذمت قرار دیا ہے۔

ایک شخص نے امام ششم حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا۔

مولا علمائے یہود تو بہرحال قابل باز پرس تھے کیونکہ وہ لوگ تورات میں تحریف کے مجرم تھے لیکن بے علم عوام سے باز پرس کیوں ہوگی؟

امامؑ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے کچھ مسائل یقیناً ایسے ہیں جنہیں سمجھنے کے لئے با قاعدہ درس کی ضرورت ہے اور جنہیں تعلیم یافتہ انسان کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ان مسائل میں کہا جا سکتا ہے کہ عوام سے باز پرس نہیں ہوگی۔ پھر بھی ان سے اتنا سوال ضرور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے علم کیوں حاصل نہیں کیا۔ لیکن کئی مسائل ایسے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے ذریعے ان کا ادراک کرتا ہے یہاں نہ مدرسے کی ضرورت ہوتی ہے نہ درس کی نہ کتاب کی نہ معلم کی بلکہ صرف عقل سلیم ہی کافی ہوتی ہے۔

آپؑ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا:۔

فرض کرو ایک عالم ہے جو لوگوں کو زہد و تقویٰ کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن خود زہد و تقویٰ کے خلاف عمل کرتا ہے لوگوں کو توبہ کی ترغیب دیتا ہے لیکن خود منہیات سے تائب نہیں ہوتا۔ اور سب جانتے ہیں کہ یہ شخص بے عمل اور بدکردار ہے۔ تو کیا ایسے شخص کے اتباع سے گریز کا جواز معلوم کرنے کے لئے بھی کسی مدرسہ درس کتاب یا استاد کی ضرورت ہے؟ کیا عقل سلیم یہ حکم نہیں لگا سکتی کہ جس شخص کا عمل اس کے قول کے خلاف ہو اس کا اتباع جائز نہیں؟ کیا انسانی فطرت ایسے انسان کی پیروی پسند کریگی؟ جواب اس کا یقیناً نفی میں ہے لیکن یہودی اپنے آنکھوں سے دیکھتے اپنی عقل سے سمجھتے اور اپنی فطرت سے محسوس کرتے تھے کہ جن علماء کی وہ پیروی کر رہے ہیں اولاً تو وہ کتاب خدا میں تحریف کے مجرم ہیں اور ثانیاً ان کے قول و عمل میں واضح تضاد اور منافات موجود

ہے۔ پھر بھی انہی کی پیروی کرتے تھے۔ لہٰذا پروردگار عالم نے ان کی مذمت فرمائی۔

تو معلوم ہوا کہ ایک سلسلہ مسائل ایسا ہے جنہیں سمجھنے کے لئے نہ مدرسے یا استاد کی ضرورت ہے نہ لکھنے اور نہ پڑھنے کی قابلیت کی نہ عربی دانی نہ فارسی دانی کی نہ صرف نحو کی تعلیم کی نہ فقہ و اصول کی تحصیل کی اور نہ فلسفہ یا منطق سیکھنے کی بلکہ صرف عقل سلیم اور فطرت سلیم کی ضرورت ہے۔

آپؐ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا ہے جو پختہ ترین اور فطری ترین مضمون سے عبارت ہے۔ فرماتے ہیں۔

انما الاعمال بالنیات ولکل امرء ما نوی۔

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے ہر اپنی نیت کی مراد پائے گا۔

عمل نیت اور قصد سے متعلق ہے اگر آپ کوئی کام کریں تو خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ اگر بلا نیت و ارادہ اور بے مقصد ہو گا تو نہ برا ہونے کی وجہ سے اس کی باز پرس ہو گی اور نہ اچھا ہونے کی صورت میں اس کا اجر ملے گا۔ یہ ایک سادہ اور عام فہم حقیقت ہے جو دلیل کی محتاج نہیں۔

اگر کوئی شخص اپنا خواب یا قصہ بیان کرے کہ اس نے یا کسی نے حالت اضطرار میں اور قطعاً بے خبری کے عالم میں ایک ایسا کام کیا ہے جس میں اس کی نیت کو ذرہ بھر بھی دخل نہ تھا یا کیا تو بقائمی ہوش و حواس خمسہ ہی تھا لیکن نیت اور ارادے میں فتور تھا کرنا کچھ اور تھا ہو کچھ اور گیا لیکن جو کام ہوا وہ اتنا عظیم الشان تھا کہ تمام صغیرہ وکبیرہ گناہوں کو محو کر دے اور کم سے کم اجر اس کا جنت فردوس ہو کیا وہ درگاہ ایزدی میں قبول اور کسی اجر کا موجب ہو گا؟ جواب اس کا یقیناً نفی میں ہے لیکن اسے سمجھنے کے لئے کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونا شرط نہیں۔ اسی طرح سب جانتے ہیں کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور انسان حسب ارشاد خداوندی۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (نیکیاں بدیوں کو ختم کر دیتی ہیں) اور

حسب فرمودہ نبوی التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (گناہوں سے تائب انسان ایسا ہے گویا کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں) بالکل پاک ہو جاتا ہے لیکن اس نیکی سے جو برضا و رغبت کی گئی ہو اور اس توبہ سے جو پورے عزم و ارادہ سے عمل میں آئی ہو۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لئے یونیورسٹی سے سند یافتہ ہونا ضروری نہیں بلکہ فطرت سلیم کی روشنی میں یہ صاف نظر آنے والی ایک واضح حقیقت ہے۔

بہشتی ڈاکو

ایک ڈاکو کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ وہ شاہراہوں کے کنارے مسافروں اور قافلوں کی گھات میں بیٹھا رہتا اور جو کوئی بھی وہاں سے گزرتا اسے لوٹ لیتا اور مداخلت کرنے والوں کو قتل کر دیا کرتا تھا۔ اسی طرح اس نے ہزاروں انسانوں کو لوٹا سینکڑوں کو قتل کیا بے شمار عورتوں کو بیوہ اور لاتعداد بچوں کو یتیم کیا۔ ایک روز اسے اطلاع ملی کہ زائرین کا ایک قافلہ مقامات مقدسہ کی زیارت کو جا رہا ہے وہ اس کی گھات میں بیٹھ گیا لیکن قافلے والوں نے کافی دیر کر دی۔ انتظار میں تھک کر وہ سو گیا اور کئی گھنٹے سویا رہا۔ اس دوران قافلہ بھی وہاں سے گزر گیا لیکن اس کی آنکھ نہ کھلی اس نے خواب میں دیکھا کہ قیامت کا میدان ہے محشر برپا ہے اور عذاب پر مامور فرشتے اسے گھسیٹتے ہوئے جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں کیونکہ اس کے سیاہ نامہ اعمال میں ذرا برابر بھی کسی نیکی کی چمک موجود نہیں۔ صرف گناہ ہی گناہ ہیں اور وہ بھی قتل و غارت گری اور رہزنی جیسے گھمبیر اور ناقابل معافی ..... لیکن جب کر دیتی ہے اور باوجود اصرار کے اپنے انکار جہنم کے دروازے پر پہنچتے ہیں تو جہنم اسے قبول کرنے سے انکار پر قائم رہتی ہے فرشتے حیران ہو کر اس سے اللہ تعالیٰ کی اس نافرمانی کی وجہ دریافت کرتے ہیں تو کھلتا یہ ہے کہ جب یہ ڈاکو سڑک کے کنارے اپنی کمین میں محوخواب تھا تو زائرین کے قافلے کی گرد اس کے سراپا پر بیٹھ گئی تھی اور اگرچہ اس کے ارادے اس قافلے کے

بارے میں بڑے ہی مذموم اور گھناؤنے تھے لیکن چونکہ قافلے کی مقدس گرد جہنم پر حرام تھی لہٰذا دوزخ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور نبی ﷺ واضح ارشاد انما الاعمال بالنیات ولکل امر مانوی کے علی رغم اس غبار کی برکت سے اس کی بدباطنی اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی اور اس کی لاعلمی ہی میں بالکل غیر متوقع طور پر اس کے سب گناہان کبیرہ محو ہو گئے۔

ظاہر میں تو یہ افسانہ بڑا حوصلہ افزا لگتا ہے لیکن مکتب حسینی کے زاویہ نگاہ سے افسوسناک حد تک حوصلہ شکن اور مایوس کن ہے میرے خیال میں اس حقیقت کی دریافت کسی بھی باقاعدہ مدرسی تعلیم کی متقاضی نہیں اور کوئی جاہل گنوار بھی آپ سے یہ نہیں کہے گا کہ جناب میں تو پڑھا لکھا ہی نہیں ہوں مجھے کیسے اس کی سمجھ آ سکتی ہے؟

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ عقلی مسلمات میں سے ہے اور انسانی فطرت کے نزدیک قطعی طور پر قابل فہم ہے لہٰذا یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ اس افسانے کو حقیقت تسلیم کر لینے سے نظام عدل الٰہی ناکارہ ہو جائے گا۔

۲۔تحریف میں مضمر خطرات

دوسری ضروری بات جس پر میں آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ تحریف میں بڑے خطرات مضمر ہیں۔ اس موضوع پر میں مختصر سی بحث کروں گا۔ گزشتہ مجالس میں میں نے اس بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔

دنیا میں تحریف کا عمل ایک امر واقع ہے۔ ہم نے واقع کربلا میں ہونے والی مختلف تحریفات کا جائزہ لیا اور اس کے عوامل پر بحث کی اب اگر کوئی پوچھے کہ جناب تحریف میں کیا قباحت ہے اور اس کے وقوع میں کون کون سے بڑے خطرات مضمر ہیں۔؟

تو اس کے جواب میں میں عرض کروں گا کہ یہ غیر معمولی خطرات کی حامل

ہے یہ ایک ایسی بالواسطہ ضرب ہے جو بلاواسطہ ضرب سے کہیں زیادہ کاری ہوتی ہے۔ اگر یہ کسی کتاب میں واقع ہو خواہ وہ لفظی صورت میں ہو یا معنوی میں تو اگر وہ کتاب کتاب ہدایت ہے تو اس کے اثر سے تبدیلیوں سے دوچار ہو کر کتاب کتاب ہدایت ہے تو اس کے اثر سے تبدیلیوں سے دوچار ہو کر کتاب ضلالت بن جائے گی۔ اگر کتاب سعادت وخوش بختی ہے تو صحیفہ شقاوت و بدبختی میں تبدیل ہو جائے گی اگر اس کا مقصد اعلائے درجات انسانی ہے تو یہ اسے انسان کے لئے پیغام تنزل وانحطاط بنا دے گی اور نہ صرف یہ کہ اس کی اصل واساس اور حقیقت و خاصیت کو بدل ڈالے گی بلکہ اگر وہ نور خالص ہے تو اسے ظلمت مطلق میں تبدیل کر دے گی۔ دنیا میں ہر حقیقت کی اس کے تناسب وجود کے لحاظ سے کوئی نہ آفت ہوتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔

آفۃ العلم النسیان یا آفۃ المال الاسراف

وغیرہ اسی طرح زبان نبوت نے دین کی آفت تین چیزوں کو قرار دیا ہے ارشاد نبوی ہے۔

آفۃ الدین الثلاث فقیہ فاجر وامام جائر ومجتھد جاھل۔

جیسے ہم کہتے ہیں کہ کیڑے مکوڑے اور ٹڈی وغیرہ نباتات یا فصل کے لئے آفت ہیں اور خود انسان کے لئے بھی مخصوص روحانی وجسمانی آفات وجود رکھتی ہیں۔ اسی طرح دین کے لئے جن آفات کا حدیث نبوی ﷺ میں ذکر ہوا ہے یعنی فاسق و فاجر اور بدکردار عالم دین ظالم حاکم اور بے علم ونادان مجتہد۔ یہ لوگ دین کی جڑیں اسی طرح کھوکھلی کر دیتے ہیں جیسے دیمک تناور درخت کو اندر ہی اندر سے کھا جاتی ہے۔ ان لوگوں کا دین کے لئے آفت ہونا صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ شرعی حدود میں حسب خواہش ردوبدل یا بالفاظ دیگر تحریف کر کے دین کے نورانی چہرے کو مسخ کر دیتے ہیں۔ تحریف ایک ایسا عمل ہے جو موضوع کی شکل کچھ سے کچھ کر ڈالتا ہے۔ لوگ اسے حقیقت

کے عنوان سے قبول کر لیتے ہیں لیکن نتیجہ اس کا ان کی توقعات کے برعکس نکلتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی مثال آپ کے سامنے ہے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایسی پر عظمت شخصیت تحریف سے دو چار ہو کر ہم میں سے بعض کے نزدیک کیا سے کیا ہو گئی ہے کچھ لوگ تو انہیں صرف پہلوانی کے حوالے سے پہچانتے ہیں اور ہم میں سے بعض نے تو معلوم نہیں کس کے غرض مندانہ بہکاوے میں آ کر آخر کار آپؑ کی پیکر تراشی بھی کر ڈالی ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کی غلط تشخص

ہم لوگ علی علیہ السلام کی تصویریں بنا بنا کر شائع کرتے ہیں جن میں سانپ کی زبان جیسی ایک دوشاخہ تلوار ہوتی ہے اور آپؑ کے بازو انسانی فہم وتصور سے ماورا عجیب سی ہیبت ناک ساخت کے ہوتے ہیں معلوم نہیں ایسی تصویریں کس نمونے سے حاصل کی گئیں پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا جناب امیر المومنین علیہ السلام کی نہ کبھی کوئی تصویر تھی اور نہ ہوگی۔ اگر اس بارے میں استفسار کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ پیرس کے فلاں عجائب گھر کی دریافت ہے! اسلام نے جو تصویر کو ممنوع قرار دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے انسان پرستی کا رجحان پیدا ہوتا ہے جو شرک پر منتج ہوتا ہے لہٰذا مسلمانوں نے تو یہ تصویریں بنائی نہیں اور آج سے چودہ صدیاں پہلے یورپی اقوام جن کے ترقی یافتہ عجائب خانوں کے آپ آج حوالے دے رہے ہیں۔ دنیا کی وحشی ترین ملتوں میں شمار ہوتی تھیں مصوری کا فن تو کجا وہ اس کے نام تک سے ناآشنا تھیں۔ پھر یہ تصویریں کہاں سے آئیں اور کہاں سے ان کے نمونے ملے۔ جن سے ان کی نقول بنیں؟ بس اپنی ذہنی اختراع سے اپنے خودساختہ تصور کے مطابق جو چاہا بنالیا کہ ان کا روئے مبارک ایسا نورانی ہوگا کہ اس کے گرد ہالہ ہوگا آنکھیں مرحب وعنتر کا زہرہ آب کر دینے والی بارعب و پرجلال ہوں گی۔ سینہ ایسا کہ جس پر

صرف آپ علیہ السلام کی معجزہ نما زرہ ہی درست بیٹھ سکے۔ بازو ایسے کہ جنہیں دیکھتے ہی خیبر اور خندق کے نظارے آنکھوں میں گھوم جائیں۔ شمشیر دو زبان ایسی کہ جبرائیل علیہ السلام کے پر قینچ کرتی دکھائی دے گھوڑا ایسا کہ صرف ایک زقند میں مدینہ طیبہ سے خیبر جا پہنچے۔ غرضیکہ ایسا سراپا بناڈالا کہ انسان تو انسان مصور ازل کو اسے علیؑ ماننے میں تردد ہو۔ ذرا غور کریں کہ یہ کسی ایسے عبادت گزار کی شبیہ ہوسکتی ہے جو قائم اللیل اور صائم النہار ہو۔ آپ نے فرق اقدس پر فولادی خود تو سجادیا لیکن کثرت سجود سے جبین پاک پر بنی ہوئی نورانی محراب کو ڈھک دیا جو ان کی بنیادی شناخت ہے۔ کیا یہ وہی علیؑ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

هو البكاء في المحراب ليلاً

جو ساری ساری رات خوف وحشیت الہٰی سے محراب مسجد میں گریہ کرتے رہتے تھے؟ کیا عبادت گزاروں کا یہی حلیہ ہوتا ہے جو اس تصویر میں ہے؟ کیا یہ کسی متقی کا سراپا ہے؟ پوری پوری رات استغفار میں گزار دینے والوں کی شکل صورت تو ایسی نہیں ہوتی۔ اہل ورع وزہد عابدوں کی وضع قطع تو اس سے بہت مختلف ہوتی ہے!

بزرگان دین میں سے کسی کا بھی چہرہ اس چہرے سے نہیں ملتا جسے ہم نے اپنے تصور میں سجا رکھا ہے اور اس محسوس پرستی میں ہم شیعان علیؑ عام مسلمانوں سے بہت آگے ہیں۔

عابد بیمار یا عابد مجاہد!۔

جناب امام علی زین العابدین علیہ السلام فارسی اور اردو میں عابد بیمار کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے لقب عابد کے ساتھ بیمار کا لاحقہ لازم اور مستقل صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن یہ چیز آپ کو کسی اور زبان میں نہیں ملے گی۔ مثلاً عربی زبان جس میں آپ کے بہت سے القاب میں سے ایک محترم لقب ''سجادؔ'' ہے آپ عربی زبان میں

ایک بھی ایسی کتاب کا نام نہیں بتا سکتے۔جس میں عابد کے ساتھ بیمار کا لاحقہ موجود ہو۔ معلوم نہیں فارسی اور اردو میں اس نام کے ساتھ بیمار کے لفظ کا دائمی اضافہ کیسے ہوا البتہ یہ حقیقت ہے کہ صرف ایام عاشورا کے دوران آپ بمشیت الٰہی ضرور بیمار پڑ گئے تھے۔لیکن یہ مصلحت وتدبیر خداوندی تھی کہ آپؑ زندہ رہیں اورنسل رسول ﷺ دنیا میں باقی رہے چنانچہ روز عاشورا یہی بیماری قتل سے آپؑ کی نجات کا سبب بن گئی۔اشقیاء نے کئی بار آپؑ کو قتل بھی کرنا چاہا لیکن عین اس دن یہ بیماری شدت پکڑ گئی تھی لہٰذا انہوں نے سوچا کہ یہ تو خود ہی دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں ان کے خون سے ہاتھ رنگنے سے کیا ملے گا اوراس طرح آپ قتل سے محفوظ رہے۔

لیکن آپ کو دائمی طور پر بیمار قرار دے دینا بڑی زیادتی ہے۔کیا دنیا میں لوگ بیمار نہیں ہوتے ؟ کون ہے جو کبھی بیمار نہ ہوا ہو؟ ہر شخص زندگی میں کسی نہ کسی وقت بیمار ہو جاتا ہے لیکن بیمار کا لفظ اس کے نام کا حصہ نہیں بن جاتا۔ میں نے کتابوں میں لکھا دیکھا ہے کہ امام زین العابدین دائمی مریض تھے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بیمار پیدا ہوئے بیمار زندہ رہے اور بیمار ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے اور زندگی بھر میں ایک بھی دن آپ نے صحت وتندرستی کا نہ گزارا۔گویا ہمارے نزدیک اپنے امام چہارم کی شناخت یہی ہے کہ ایک سبحہ بدست نحیف ونزار لاغر و ناچار اور زرد رو بیمار ہے جس کا بدن تپ کی شدت سے جل رہا ہے کمر اس کی خمیدہ اور ٹانگیں بدن کا بوجھ اٹھانے کے ناقابل ہیں اس لئے دعا کا ورد کرتا ہوا عصا کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہا ہے اس حلیہ اور وضع قطع والے کے سوا ہم کسی کو اپنا چوتھا امام مانیں گے ہی نہیں۔اسی تحریف شدہ اور خالص جھوٹ پر مبنی حلیے کے حوالے سے جو روضہ خوانی کی جائے گی اس پر ہم روئیں گے بھی آہ ونالہ بھی کریں گے اور فریاد و واویلا کا شور وشین بھی بلند کریں گے۔ بلکہ بعض اوقات فرط گریہ سے خود پر بیہوشی اور غشی بھی طاری کر لیں گے کہ لوگ کہیں:۔

آفرین ہے اس عزادار پر کہ عابد بیمار کے غم میں خود بھی بعینہ عابد بیمار ہی ہو

گیا ہے۔

لیکن اگر دائمی بیماری کے حوالے کے بغیر صحیح واقعات بیان ہوئے تو بھولا بھٹکا نمایشی یا روادارانہ۔ ایک آنسو بھی ہماری خشک آنکھوں سے نہیں بہے گا۔ اب بتائیے کہ جس عزاداری کی تفصیل اوپر بیان ہوئی یہ آپ نے کس کے لئے کی؟ امام چہارم حضرت زین العابدین کے لئے؟ جی نہیں بلکہ عابد بیمار کے لئے جو اسیران کربلا کی تبلیغی جماعت میں کہیں نظر نہیں آتا۔ تو جناب اپنی عاقبت کی خیر منائیے۔ کیوں بلا وجہ رورو کر ہلکان ہو رہے ہیں؟

یقین کیجئے کہ امام زین العابدین علیہ السلام ماسوائے روز عاشورا کے ساری عمر اتنے ہی فعال رہے جتنے خود جناب سید الشہداء علیہ السلام امام پنجم حضرت محمد باقر علیہ السلام یا امام ششم حضرت جعفر صادق علیہ السلام آپ واقعہ کربلا کے بعد چالیس سال زندہ رہے اور صحت مند تا ھلی اور تبلیغی زندگی جیے۔ لیکن ہم ہیں کہ بیمار بیمار کی رٹ لگائے چلے جا رہے ہیں۔

خدا مغفرت کرے علامہ مرحوم آیتی طاب ثراہ بڑے عظیم الشان انسان تھے جو ہمیں چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اس مرد عظیم نے چند سال قبل ایک ماہانہ دینی اجتماع میں راہ ورسم تبلیغ کے موضوع پر بحث کی جو ہماری کتاب کی مجلس دوم میں ضبط تحریر میں آ چکی ہے امام چہارمؑ کے بارے میں انہوں نے کہا۔

ہمیں کیا ہوا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ ہم نے بیماری کی ایک مستقل نسبت قائم کر دی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ شیعوں کے امام جو امام وقت بھی تھے جب ساری عمر بیمار رہے تو اس مدت میں امور امامت جو بقول ان کے رسالت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا تسلسل ہیں کس نے انجام دیئے۔ کیا اس ساری مدت میں یہ اہم کام معطل رہا۔؟

اس ضمن میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا:۔

کچھ دن پہلے میں کسی ماہوار رسالے میں ایک مقالہ پڑھ رہا تھا۔ مقالہ نگار نے حکومت اور اس کے ارباب حل وعقد پر کڑی تنقید کی تھی کہ ان کی اکثریت کے جن افراد کے پاس کوئی لائحہ عمل ہے وہ فطرت کے اچھے نہیں اور جو فطرت کے اچھے ہیں ان کے پاس لائحہ عمل موجود نہیں۔ اس نے مزید لکھا تھا کہ یہ لوگ یا شمر ہیں یا عابد بیمار۔ جب کہ ہمیں نہ شمر کی ضرورت ہے نہ بیمار امام کی بلکہ ہمیں عباس کی ضرورت ہے۔ جو صاحب لیاقت بھی ہو اور پاک فطرت بھی!۔

یعنی شمر لیاقت رکھتا تھا لیکن بدفطرت اور ناپاک تھا جب کہ امام زین العابدینؑ پاکیزہ فطرت اور طاہر نہاد تھے لیکن بیماری کی وجہ سے امور امامت کے ادارے کے قابل نہ تھے لہٰذا حضرت عباس دونوں سے بہتر تھے کہ لائق بھی تھے اور پاک فطرت بھی۔

افضل کون؟امام یا ماموم

اب آپ امام زین العابدینؑ کو بیمار ماننے والوں سے کہیں کہ سلسلہ امامت بیان کریں۔ چوتھے امام کا نام وہ علی زین العابدین علیہ السلام بیمار بتائیں گے یعنی ایسا امام جو عالی فطرت اور پاکیزہ نہاد تو ضرور تھا لیکن بیماری کے باعث امورامامت کے ادارے کی لیاقت و صلاحیت نہ رکھتا تھا تو کیا اسے یہ جواب نہیں دیا جاسکتا کہ پھر ان کے مقابلے میں تو حضرت عباسؑ جو دونوں اوصاف پاکیزگی فطرت اور لیاقت کے جامع تھے۔ کہیں بہتر تھے تو یہ کیسے امام تھے کہ ان کے ماموں ان سے افضل تھے اور افضل کی موجودگی میں ایک کم فضیلت وکم لیاقت انسان کیسے امام ہوسکتا ہے۔ یہ کیا امامت ہوئی اور کیسی پیشوائی؟

دیکھا آپ نے کہ ایک معمولی سی بات کتنے بڑے انحراف کا باعث بن گئی۔ یقین کیجئے کہ ہم لوگ ایک ضعف پسند اور ضعیف پرست قوم ہیں اور اس کا بنیادی سبب یہی جھوٹ اور تحریف ہے جس کی نسبت ہم نے امام زین العابدینؑ کی طرف

دے رکھی ہے۔

امام بیمار کا شوربا

شمس واعظ تہرانی مشہد کی ایک معروف شخصیت تھے ایک روز انہوں نے ہمیں شام کے کھانے پر مدعو کیا۔ہم نے سوچا کہ خصوصی ضیافت ہوگی لیکن دسترخوان پر بیٹھ کر معلوم ہوا کہ کافی عمومی ہے۔

دسترخوان پر ہر شخص کے سامنے ایک پلیٹ رکھ دی گئی لیکن میں کوشش کے باوجود نہ سمجھ سکا کہ اس میں ہے کیا؟ جب کھانا شروع ہوا تو میں نے بھی پلیٹ میں ہاتھ ڈالا لیکن وہ چیز اتنی گاڑھی سخت اور چپکیلی تھی کہ ہاتھ کے ساتھ ہی پلیٹ سے باہر نکلی جاتی تھی۔ جب سب مہمان کھانے میں مشغول ہوئے تو میں نے میزبان کو بلایا اور عرض کیا جناب یہ کیا کھانا ہے جو زبان وحلق کو کھاتا ہے۔

وہ بولے" آپ کے لئے بڑے عیب کی بات ہے کہ ایسے الفاظ زبان پر لائیں"

میں نے کہا وہ کیسے اور کیوں؟

بولے: یہ امام زین العابدین بیمار کا شوربا ہے۔

میں نے کہا اگر یہ سچ ہے تو یقیناً اسی نے انہیں بیمار کیا ہوگا!۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں نے کن کن طریقوں سے ان ذوات قدسیہ پاکیزہ چہروں کو مسخ کیا ہے اور بدستور کر رہے ہیں۔

امامت جیسا کہ آپ نے گزشتہ مجالس میں بھی سنا۔ انسانوں کے لئے ایک نمونہ ہے یعنی وجود امام کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ وہ ایک فوق العادت انسان ہو بالکل اسی طرح جیسے کہ انبیاءعلیہم السلام مہبط وحی ہونے کے امتیاز کے حامل انسان ہوتے ہیں تا کہ ان کی سیرت طیبہ کی پیروی سے نوع بشر اخلاق وکردار کے مدارج عالیہ تک رسائی حاصل کرے۔لیکن جب ان کے نور حق و ہدایت سے منور چہرے اس قدر مسخ کر دیئے

جائیں کہ ان کے خدوخال تاریکیوں میں ڈوب جائیں تو پھر انسان کس کی پیروی کرے کیونکہ خیالی شخصیتوں کی پیروی سے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا۔

اب ہمیں تحریف کی مختصر تفصیل معلوم ہو گئی اور ہماری سمجھ میں آ گیا کہ اس میں کیسے کیسے بڑے خطرے چھپے بیٹھے ہیں یہ مقصد کو ناکام اور ہدف کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے یہ واقعی ایک بالواسطہ ضرب ہے جو بلاواسطہ ضرب سے بہت زیادہ کاری تباہ کن ہوتی ہے اور ایک خنجر ہے جو پشت میں گھونپا جاتا ہے۔ میں نے کسی مجلس میں عرض کیا تھا کہ یہود میدان تحریف کے یکہ تاز شہسوار رہے ہیں۔ تاریخ انسانیت میں کوئی بھی ان سے زیادہ تحریف کا مرتکب نہیں ہوا اور اسی وجہ سے نوع بشر کو ان سے زیادہ نقصان کسی نے نہیں پہنچایا۔ سب سے زیادہ انہی نے حقائق کو مسخ کیا اور بدعتیں ایجاد کیں۔ انہی نے پیشوایان دین کے نام سے ہر دین و مذہب میں اسرائیلی خرافات داخل کئے اور ان کی تبلیغ کی ہم ان کے ان کرتوتوں پر اجمالی روشنی ڈال چکے ہیں۔

ہمارے فرائض

یہ جاننا ضروری ہے کہ ہماری ذمہ داریاں بہت کڑی ہیں خصوصاً عصر حاضر میں تو یہ دو چند ہو چکی ہیں اب مزید تحریف شدہ واقعات بیان کر کے انسانیت کی خدمت کا زمانہ نہیں۔ ماضی میں بھی اگرچہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا لیکن ضرر بھی بہت زیادہ نہیں پہنچا۔ لیکن دور حاضر میں اس سے اتنے زیادہ ضرر کا اندیشہ ہے کہ اس کا اندازہ ہی ممکن نہیں۔ ہمیں خوب سمجھ لینا چاہئے کہ آج ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اپنی تاریخ میں واقع ہونے والی تحریفات کا سراغ لگائیں اور دیکھیں کہ ہمارے بزرگوں کی سیرت نگاری میں کیا کیا تحریف ہوئی ہے۔

نیز یہ دیکھیں کہ قرآن مجید میں کون کون سی تحریفات کی گئی ہیں لیکن یاد رہے کہ قرآنی تحریف سے مراد لفظی تحریف نہیں یعنی قرآن مجید میں ایک بھی لفظ کا نہ اضافہ

ہوا نہ کمی ہوئی۔لیکن جیسا پہلے عرض ہو چکا کہ معنوی تحریف لفظی تحریف سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔لہٰذا غلط تعبیر اور غلط توجیہہ سے خبردار رہنا لازمی ہے۔ ہماری تاریخ کے وہ ابواب جو ہمارے لئے درس عبرت ہیں ہمارے لئے اخلاقی اور اجتماعی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔خصوصاً واقعہ کربلا ہمارے لئے بڑی رہنمائی کا ذریعہ ہے اس میں تحریفات کے درآنے کو ہر قیمت پہ روکنا ہمارا فرض ہے۔

علماء کے فرائض

علمائے امت کے فرائض عوامی فرائض سے مختلف ہوتے ہیں عالم خود کو ہمیشہ عوام کے نکات ضعف یا ان کے عیوب و نقائص سے روبرو پاتا ہے۔روحانی اخلاقی اور اجتماعی ضعف کے نکات کو افراد معاشرہ کی بیماری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔لیکن یہ بیماری جسمانی بیماریوں جیسی نہیں ہوتی جن کا مریض کو خود بھی احساس ہوتا ہے اور جن کے علاج کی وہ تدبیر بھی کرتا ہے۔روحانی بیماری میں بنیادی مشکل یہ ہوتی ہے کہ مریض کو اس کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ جسم اس کا صحیح وسالم ہوتا ہے۔

روحانی ضعف کے نکات دراصل اخلاق میں ہوتے ہیں لیکن اخلاق نہ صرف یہ کہ ان کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات انہیں اپنے لئے وجہ قوت سمجھتے ہیں۔

معاشرے کے نکات ضعف کی تشخیص علماء ہی کر سکتے ہیں اور علماء جو خود کو ضعف اجتماعی کے نکات سے روبرو پاتے ہیں دو قسم کے ہیں اور دراصل دوراھے کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

ایک عالم وہ ہے جو عوام کے نکات ضعف سے باقاعدہ لڑتا اور انہیں ہر طریقے سے زائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ عالم مصلح ہوتا ہے اور ہزاروں میں ایک ہوتا ہے۔

دوسری قسم ان علما کی ہے جو جب دیکھتے ہیں کہ عوام کے نکات ضعف سے لڑنا

ایک مشکل کام ہے جو اپنی ذات کے لئے ضرر رساں بھی ہوسکتا ہے یا کم از کم اس میں فائدہ کوئی نہیں تو وہ انہی نکات ضعف کو آلہ کار بنا کر ان سے استفادہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے علما کو فقیہ فاجر کہا جاتا ہے۔ آپؑ نے انہیں دھواں دینے والی آگ سے تعبیر فرمایا ہے۔

سب مسائل پر بحث ممکن نہیں میں صرف واقعہ کربلا ہی پر اپنی بحث کو منحصر رکھوں گا۔ عزاداری سید الشہداء علیہ السلام کے بارے میں عوام کے دو نکات ضعف ہیں جن کا علاج ضروری ہے۔

ا۔ بانیان مجالس خواہ وہ اپنی مجالس مساجد میں منعقد کریں یا اپنے گھروں میں اور اپنے گھروں میں مجالس برپا کرنے والوں کے بارے میں تو یہ بالخصوص صحیح ہے اور جہاں تک میرا مشاہدہ ہے اس میں استثناء بھی کوئی نہیں اور سامعین پر بھی یہ بات مساوی طور پر منطبق ہوتی ہے کہ سب کی نظروں میں مجلس کی کامیابی کا معیار صرف یہ ہے کہ مجمع بہت بڑا ہو۔ ورنہ مجلس کامیاب نہیں۔

لیکن انہیں کون سمجھائے کہ میاں مجالس عزا کا بنیادی مقصد مجمع گیری یا جمعیت اندوزی نہیں بلکہ اس کا اصل ہدف حقائق فہمی حقائق آشنائی۔ حقائق شناسی اور تحریفات کا ازالہ ہے۔ یہاں ایک اور نکتہ ضعف ہے جس سے بیچارہ مجلس خواں دو چار ہے۔ وہ اس تذبذب میں مبتلا ہے کہ اس نکتہ ضعف کا مقابلہ کرے یا اس سے استفادہ کرے؟ اگر اس سے مقابلہ کرنا چاہے تو سامعین کو صرف حقائق بتائے گا اور تحریفات سے اجتناب کرے گا یا انہیں چیلنج کرے گا اور اسے اس بات کی پرواہ نہ ہوگی کہ مجلس لگتی ہے یا نہیں لگتی یا مجلس گاہ بھرتی ہے یا نہیں بھرتی۔ لیکن یہ چیز بانی مجلس جس نے اس کے انعقاد پر اتنا کچھ خرچ کیا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا اہتمام کیا ہے اور سامعین جو اتنی زحمت اٹھا کر دور دور سے آئے ہیں۔ دونوں کی توقعات کے خلاف اور ان کے ہدف سے متصادم ہے۔ اور بالخصوص ایسی صورت میں تو بانی مجلس کے لئے قطعاً ہی ناقابل قبول

ہے جب اس کا ارادہ کسی پہلے سے ہو چکنے والی کامیاب اور بھری ہوئی مجلس سے اپنی مجلس کو کامیاب تر ثابت کرنا اور ذہنوں سے اس کے تاثر کو زائل کرنا ہو۔

اور اگر وہ اس نکتہ ضعف سے استفادہ کرنا چاہے تو پھر اسے حقائق وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رہتا اور اس کا واحد مقصد ہر جائز و ناجائز طریقے سے مجمع سامعین میں اضافہ کرنا اور جھوٹے سچے اور من گھڑت واقعات کے بیان سے ان کی ناقص و ناپختہ عقول پر سوار ہو کر اپنی شہرت و دولت میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس سے بانی مجلس کا مقصد بھی برآئے گا اور حاضرین بھی پوری طرح محفوظ ہو کر جائیں گے۔

اس مقام میں مجلس خوان دوراھے پر کھڑا ہوتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اول الذکر ذمہ دارانہ رستہ اختیار کر کے صرف اپنی عاقبت سنوارے یا موخر الذکر راہ پر چل کر دولت عزت شہرت سب کچھ حاصل کر لے۔

پھر ایک اور نکتہ ضعف جو مجالس عزا میں نظر آتا ہے وہ مجلس لگنے سے تعلق رکھتا ہے یعنی مجلس خوان کے لئے ضروری ہے کہ ذکر مصائب کربلا ایسے انداز میں کرے کہ سامعین صرف رونے اور آنسو بہانے ہی پر اکتفا نہ کر لیں بلکہ دیواروں کے ساتھ سر پٹخیں اور واویلا کا اتنا کہرام مچے کہ مجلس کربلا بن جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجلس میں ذکر مصائب سے کہرام نہ مچے نہ یہ کہتا ہوں کہ مجلس کربلا نہ بنے۔ بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ذکر حقائق سے مجلس جتنی بھی لگے خوب ہے اور وجہ ثواب ہے۔ اگر واقعات کربلا بلا کم وکاست و اضافہ وزیادت بیان تفصیلات شامل کی جائیں بلاجعل وتحریف ہوں ایسے اصحاب حسینؑ کے ذکر کے بغیر ہوں۔ جنہیں تاریخ نہیں جانتی ایسے فرزاند حسینؑ کے ذکر کے بغیر ہوں جن کا دنیا میں کوئی وجود نہ تھا۔ ایسے دشمنان حسینؑ کے ذکر سے پاک ہوں جن کے ناموں تک سے تاریخ ناآشنا ہے اور فرضی حامیوں اور مدد گاروں کا ذکر بھی ان میں نہ ہو تو ان پر آپ اشک ریزی کریں گے گریہ کریں واویلا کریں شور وشین برپا کریں۔ تو خوب ہے اور مجلس کو کربلا بھی بنا دیں تو بھی کوئی مضائقہ

نہیں۔لیکن اگر دروغ گوئی وتحریف سے یہ نتائج پیدا کرنا چاہیں تو یہ عمل مظلوم کربلا پر یزیدیوں کی طرف سے ہونے والے مظالم پر ایک جدید اور شدید تر ظلم کا اضافہ ہوگا۔ اور سید الشہدا اور ان کے اعلیٰ مقاصد اور پاکیزہ اہداف کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ایک معاندانہ اور معاد یانہ فعل ہوگا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں اپنی تعلیم کے ابتدائی زمانے میں قم سے فریمان جایا کرتا تھا تو کبھی کبھی منبر پر بھی جاتا تھا۔ایک دفعہ میں مشہد گیا۔ وہاں ایک بڑا کاری گر روضہ خوان تھا جو قہاری کے لقب سے مشہور تھا۔ ایک رات مجھے اس کی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس روضہ خوان نے وہاں سو فیصد جھوٹے مصائب پڑھے اور بار بار کہتا تھا میں نے بزرگوں سے سنا ہے۔

مرحوم آیتی فرمایا کرتے تھے

نگواز بزرگان بگواز دروغ گویاں
مگر ایں کہ بگوی از بزرگان دروغ گویاں

بعینہ اسی مطلب کو ایک اردو شاعر نے اپنی سادہ شاعری میں یوں نظم کیا ہے

جب بھی تو جھوٹی بات کرے
مت کہہ کہ سنی ہے بزرگوں سے
الا وہ بات کہ جو تو سنے
خود اپنے جھوٹے بزرگوں سے

پھر اس روضہ خوان نے اپنے ایک بچے کا وجود ایجاد کیا جس کا سراغ نہ فرزندان امام مظلوم میں ملتا ہے اور نہ ہی تاریخ کربلا میں کہیں اس کا ذکر موجود ہے۔ پھر کہنے لگا۔

عمر سعد کے لشکر کے ایک سوار نے اس بچے کی گردن رسی سے باندھ رکھی تھی اور اسے گھسیٹتا ہوا لئے جا رہا تھا اور اس کے سپاہی اسے کوڑے مار مار کر آگے چلنے پر مجبور

کر رہے تھے اسی حالت میں رسی کس گئی اور وہ معصوم گلا گھٹنے سے شہید ہو گیا۔ اس پر سامعین دھاڑیں مار مار رونے لگے اور آہ وواویلا کا طوفان مچ گیا۔

جب وہ شخص منبر سے اترا تو میں نے اسے جا لیا اور اس سے پوچھا یہ واقعہ آپ نے کس سند سے بیان کیا ہے لیکن میرے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولا صاحب زادے میرے مجالس میں آیا کرو جلد سیکھ جاؤ گے اور بڑے فائدے میں رہو گے۔

اب یہ جو ہمارے عوام کا نکتہ ضعف ہے اس سے کیسے نمٹا جائے؟ کیا اسے آلہ کار بنا کر اپنے سادہ لوح عوام کو لوٹا جائے؟ کیا انہیں اس سادہ لوح پر برقرار رکھا جائے تا کہ حسب خواہش وضرورت انہیں بے وقوف بنا کر ان کی جیبیں کاٹی جاسکیں۔؟

ہرگز نہیں۔ بلکہ ہمارے علما کا سب سے بڑا فرض معاشرے کے ان نکات ضعف کا مقابلہ کرنا ہے۔

یہی مفاد ہے فرمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا

اذاظهرت البدع فعلى العالم ان يظهر علمه والا فعليه لعنة الله۔

جب بدعتیں سر اٹھائیں تو عالم کا فرض ہے کہ اپنے علم سے انہیں ختم کرے ورنہ اس پر خدا کی لعنت ہو گی۔

نیز ارشاد خداوندی

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ [1]

ان لوگوں پر جو واضح ارشادات الٰہی کو چھپاتے ہیں اللہ تعالیٰ

[1] سور البقرہ:۱۵۹

اور سب لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

اپنے مقالے ختم نبوت میں بھی میں نے لکھا تھا کہ تحفظ ختم نبوت کے لئے علما پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ تحریف کے چیلنج کو قبول کریں اور اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ خوش قسمتی سے اس کے لئے ہمارے پاس مناسب اسلحہ موجود ہے اور ایسے علمائے اعلام بھی ہمیشہ کی طرح موجود ہیں جنہوں نے ان نکات ضعف سے کامیاب مقابلہ کیا ہے۔

کتاب لولوو المرجان بھی جس کا ذکر میں حادثہ عاشورا کے ضمن میں گزشتہ مجالس میں کرتا رہا ہوں مرحوم حاجی نوری نوراللہ مرقدہ کی ان نکات ضعف کے مقابلے میں ایک بہت مقدس کوشش ہے۔ جو مذکورۃ الصدر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریف کے اس حصے: ''اذا ظهرت البدع فعلی العالم ان يظهر علمه'' کی مصداق ہے یقیناً یہ علما کا فرض اولین ہے کہ ایسے حالات میں حقائق کو کھول کر بیان کریں خواہ عوام کو ابتدا میں یہ بات اچھی نہ ہی لگے اور دروغ و تحریف کے خلاف جہاد جاری رکھیں۔ نیز جھوٹوں اور تحریف بازوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنا بھی ان کا فریضہ منصبی ہے۔

اس مقام پر ایک بات بہت غور طلب ہے۔ سب فقہا بلا لحاظ مذہب و مسلک اس پر متفق ہیں کہ غیبت حرام ہے خواہ وہ زندہ کی ہو یا مردہ کی۔ لیکن ایک غیبت ایسی ہے جو اس حکم سے مستثنیٰ ہے اور تمام علمائے عظام نہ صرف اس کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ اسے لازمی اور بعض اوقات واجب قرار دیتے ہیں۔ سنا آپ نے؟ غیبت واجب ہے۔ لیکن اس واجب غیبت کو ایک اصطلاحی نام دیا گیا ہے اس غیبت کو جرح راوی کہا جاتا ہے۔ اس غیبت کا موضوع رواۃ حدیث کی پرکھ ہے۔ اس میں دیکھا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام علیہ السلام سے حدیث روایت کرنے والا شخص کیسا ہے کس کردار کا ہے سچا ہے یا جھوٹا فاسق و فاجر ہے یا نیکوکار و نیک سیرت اخلاق جرات رکھتا ہے یا بزدل ہے۔ ایمانی حالت اس کی کیا ہے اور وہ ایمان کے کس درجے پر فائز ہے؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امامؑ کے حوالے سے آپ ہر اچھے برے شخص سے تو روایت

قبول نہیں کر سکے۔ لہٰذا اس کی پرکھ ضروری سمجھی گئی اور اگر اس میں ذرا بھر بھی کوئی عیب نکل آئے تو پھر نہ صرف جائز بلکہ لازم ہے کہ اسے رسوا کیا جائے۔ مثلاً ایک راوی اسحاق بن نہاوندی ہے جس نے مشہد جناب شہر بانو کی روایت کی ہے اور اگر چہ کافی میں اسے نقل کیا گیا ہے لیکن یہ شخص افسانہ ساز اور جھوٹا تھا لہٰذا اسے رسوا کرنا ضروری ہے یہی وہ غیبت ہے جس کا اصطلاحی نام جرح ہے اور جو نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات واجب ہوتی ہے حالانکہ غیبت نہ زندہ کی جائز ہے نہ مردہ لیکن یہاں چونکہ حقائق کی تحریف کا محاسبہ مقصود ہوتا ہے حقائق کو بدلنے اور مسخ کرنے کے جرم کی چھان بین منظور ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس جرم کے مرتکب کو رسوا کیا جائے خواہ وہ ملا حسین کاشفی ہی کے قد کاٹھ کا عالم اور تاریخ نویس ہو جس نے روضۃ الشہدا لکھ کر تاریخ میں تحریف کا ایک مستقل باب کھول دیا۔ یہ ایسی کتاب اس نے تالیف کی ہے جس نے نہ مظلوم کو بخشا نہ ظالم کو واقعات عاشورا کے بیان میں اس نے جہاں اہل بیتؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افترا پردازی کی ہے وہاں عمر سعد اور ابن زیاد کے بارے میں بھی بہت سی دروغ بافیاں کی ہیں۔ مثلاً لکھتا ہے ابن زیاد نے ۵۰ خروار سونا اور چاندی عمر سعد کو دے کر کربلا کی مہم پر راضی کیا۔ اب جو بھی شخص یہ سنے گا۔ عمر سعد کو اگر بالکل بے قصور نہیں تو بہت حد تک کم تقصیر تو ضرور ہی سمجھے گا پچاس خروار سونا لے کر تو کوئی بھی شخص اس کام پر آمادہ ہوسکتا تھا۔

مثلاً ملا دربندی ایک اچھے انسان تھے حتیٰ کہ حاجی نوری نے بھی جنہوں نے انکی کتاب پر کافی تنقید کی ہے لیکن اس میں پوری حق گوئی سے کام لیا ہے انہیں ایک قابل تعریف انسان قرار دیا ہے اور سید الشہدا علیہ السلام کے حق میں تو اتنے مخلص تھے کہ آپؑ کا نام سنتے ہی ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ فقہ واصول کے اچھے عالم تھے۔ اگر چہ خود کو درجہ اول کا فقیہ سمجھتے تھے لیکن دوسرے یا تیسرے درجے کے ضرور تھے۔

انہوں نے فقہ پر ایک کتاب تحریر کی ہے جو چھپ بھی چکی ہے صاحب جواہر کے معاصر ہیں ایک دفعہ انہوں نے صاحب جواہر سے پوچھا آپ کی کتاب کا نام کیا ہے؟انہوں نے جواب دیا جواہران کی اپنی کتاب کا نام خزاین تھا کہنے لگے ایسے جواہر ہمارے ''خزاین'' میں بہت ہیں۔

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ جواہر کے اب تک دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور کوئی بھی ایسا فقیہ موجود نہیں جس نے اس کتاب سے استفادہ نہ کیا ہو اور نہ ہی کوئی فقیہ اس سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ درانحالیکہ خزاین کا صرف ایک ایڈیشن شائع ہوا ہے جس کے بعد مانگ نہ ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت بھی چند سال پہلے چندتومان سے زیادہ نہیں تھی۔

بہرحال باوجود اس کے کہ ملا دربندی ایک مشہور عالم ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب خالصتاً واقعات کربلا پر اسرار الشہادت کے نام سے تحریر کی ہے لیکن تمام واقعات میں تحریف کر دی ہے انہیں مکمل طور پر بدل ڈالا ہے اور ایسے ایسے من گھڑت افسانے اور واہیات تفصیلات اس میں داخل کر دیں ہیں کہ یہ عظیم ترین تاریخی سانحہ بے اثر ہو کر رہ گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب سراسر جھوٹ ہے اور اگر کہیں کہیں اس میں کوئی سچائی کی جھلک ملتی بھی ہے تو اس کی حیثیت بھوسے کے انبار میں گندم کے چند دانوں سے زیادہ کی نہیں۔

اب صرف اس وجہ سے ملائے مذکور ایک عالم تھے متقی تھے اور جناب سید الشہداء علیہ السلام کے مخلصین میں سے تھے ان کے بارے میں سکوت اختیار کرنا ضروری ہے اور ان کی کتاب پر زبان تنقید دراز کرنا جائز نہیں؟ کیا حاجی نوری مرحوم کو بھی حق نہیں کہ اسرار الشہادت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں یا اس کے ماخذ ہی کا نام لے لیں جو ایک بے نام اور قطعی طور پر ایک بے سر و پا کتاب ہے جس کے نہ ابتدائی

صفحات موجود ہیں نہ آخری۔ لہٰذا نہ اس کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے نہ آخر کا۔ صرف اس کے حاشیے میں یہ الفاظ تحریر کریں کہ یہ ایک عالم جبل عاملی کی تالیف ہے لیکن جب ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس عالم کی اس نام کی کوئی کتاب نہیں اور جب خود اس کتاب کا مطالعہ کیا تو سراسر جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوئی۔ معلوم نہیں کہ ملا دربندی کو اس میں کیا نظر آیا کہ انہوں نے اسے سامنے رکھ کر من وعن اپنی کتاب میں نقل کر دیا۔ اب آپ خود سوچیں کہ کیا کسی عالم کو یہ چیز زیب دیتی ہے؟

اس موضوع پر کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن فی الحال اتنے ہی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے دلوں کو حق وحقیقت کے نور سے روشن فرمائے اور تحریف کی وجہ سے ہم جن گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں انہیں معاف فرمائے۔ اور تحریف کے خلاف جہاد میں ہمیں اپنے فرائض پوری خوش اسلوبی سے انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

اے پروردگار ہم سب کی عاقبت بخیر فرما

رحم اللہ من قرأ الفاتحۃ مع الصلواۃ

والسلام

مجلس پنجم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین
والصلوٰۃ والصلوٰۃ والسلام علی عبداللہ ورسولہ
وحبیبہ وصفیہ سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ
والطیبین الطاہرین المعصومین

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ ۚ [1]

امام حسین علیہ السلام نے اپنے زمانے کے ایک انتہائی نازیبا تصرف کے خلاف قیام کیا اور اپنے ہدف کے حصول کی راہ میں شہید ہوگئے۔ آپؑ کی عزاداری کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں جن سے کوئی امامی اثنا عشری شخص انکار نہیں کرسکتا۔

باالفاظ دیگر عزاداری امام مظلومؑ مسلمات مذہب شیعہ میں سے ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی طرف سے بہت سی تاکید وارد

[1] سور المائدہ: ۱۳

ہوئی ہے علاوہ ازیں شیعی اثنا عشری شعرا کو بھی تاکیدی ہدایت کی گئی کہ عزاداری کے موضوع پر شعر کہیں اور ظلم کے خلاف عوام کے احساسات کو برانگیختہ کریں اور دوسری طرف سے غم حسین علیہ السلام میں رونے اور اشکباری کرنے والوں کی بڑی تعداد قدر افزائی کی گئی ہے اور بہت سی احادیث بھی آنجنابؑ کے مصائب پر گریہ کرنے کے ثواب کے بارے میں مروی ہیں۔ ان ساری احادیث کو یہاں بیان کرنا مقصود نہیں لیکن اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ ہمارے مذہب کا بنیادی دستور ہے۔ اس مقام پر دو سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔

ا۔اس دستور کا فلسفہ کیا ہے؟ پیشوایان دین نے کس وجہ سے تاکیدی حکم دیا ہے کہ حسین بن علی علیہ السلام کے نام اور ان کے ذکر کو زندہ رکھا جائے۔کربلا کے مصائب بیان کر کے یا انہیں سن کر گریہ کیا جائے۔ **یالیتنی کنا معکم فنفوز فوزاعظیماً** کے الفاظ سے ان پر فدا نہ ہو سکنے کی حسرت کا اظہار کیا جائے اور شہدائے کربلا کی زیارت کی سعادت حاصل کی جائے؟

۲۔سید الشہداء علیہ السلام کے قیام کا فلسفہ کیا ہے۔آپؑ نے قیام کیوں فرمایا اس قیام کے علل و موجبات اور اس کے محرکات کیا تھے؟

ہم شیعان علی علیہ السلام کا عقیدہ ہے کہ دین کے دستور کی کوئی بھی شق کسی نہ کسی حکمت یا فلسفے سے خالی نہیں ہے۔لہٰذا قیام امام علیہ السلام کے فلسفے اور عزاداری کے ذریعے کربلا کو زندہ رکھنے کی تاکید کی اہمیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے جب یہ دونوں حقیقتیں سمجھ میں آ گئیں تو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ یہ دستور کتنا عظیم الشان ہے اور سانحہ عاشورا سے کیا سبق حاصل ہوتا ہے۔

مقصد قیام حسینی علیہ السلام

امام حسین علیہ السلام نے کیوں قیام کیا؟اس سوال کے جواب کی تین تفسیریں ممکن ہیں۔

۱۔قیام حسین علیہ السلام ایک عام اور معمولی نوعیت کا قیام تھا جو شخصی اہداف ومنافع کی خاطر عمل میں آیا۔

۲۔شہادت امام علیہ السلام کا مقصد امت کے گناہوں کی بخشش تھا یہ شہادت امت کے گناہوں کے کفارے کے عنوان سے واقع ہوئی یہ عقیدہ بعینہ وہی ہے جو عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں قائم کر لیا ہے کہ آپؑ نے اپنی امت کے گناہوں کے فدیے کے طور پر سولی پر چڑھنا قبول کیا۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کئے ہوئے گناہ روز قیامت انسانوں کے امن گیر ہوں گے لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے شہادت قبول فرمائی تا کہ امت کے گناہوں کا فدیہ بن کر ان کے اثر کو باطل کر دیں اور امت کو عذاب آخرت سے بچا لیں۔اس عقیدے کے پیش نظر تو یہ کہنا ہرگز غلط نہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے ملاحظہ فرمایا کہ دنیا میں یزیدوں ابن زیادوں شمروں عمر سعدوں سنانوں خولیوں کی تعداد کم ہے لہٰذا آپ نے چاہا کہ کوئی ایسا کام کریں۔جس سے ان کے عدد میں اضافہ ہو جائے۔چنانچہ ایک مکتب قائم کر دیا۔یزید ساز اور شمر ساز مکتب۔!۔

ظاہر ہے کہ یہ انداز فکر اور یہ طرز تفسیر اتنا خطرناک ہے کہ عزاداری اس کے

فلسفے اور اس کے ابقاء کی تمام حکمت کو زائل کرنے اور اسے عبث غلط اور باطل ثابت کرنے کے لئے اس سے زیادہ قوی عامل کوئی نہیں۔

یقین کیجئے کہ سب سے بڑی وجہ ہماری بے فکری لا ابالی پن اور عمل سے سرکشی کی یہی ہے کہ قیام امام علیہ السلام کے فلسفے کی انتہائی غلط اور گمراہ کن تفسیر ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے۔

مرجیہ ایک فرقہ تھا جن کا عقیدہ تھا کہ انسان کی نجات و رستگاری کے لئے صرف عقیدہ اور ایمان کافی ہے عمل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اگر عقیدہ درست ہے تو اعمال جتنے بھی قبیح ہوں اللہ تعالیٰ کی بخشش یقینی ہے۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کا ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

هوءلا أطمعر الفساق فی عفو الله۔

ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی امید میں فاسقوں کے فسق کی حوصلہ افزائی کی۔

یہ اس زمانے میں مرجیہ کا عقیدہ تھا جب کہ شیعی عقیدہ اس کی عین ضد ہے اور ان کے نزدیک حسب نص قرآنی **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی لازمی ہے۔

۳۔ قیام حسینی کا مقصد احیاء و اعلائے کلمۃ الحق اور ابطال باطل تھا۔ اور آپؑ کی عظمت کے پیش نظر یہی تفسیر مناسب و معقول ہے۔ دنیائے اسلام اس وقت انتہائی نازک اور ناسازگار صورت احوال سے دو چار تھی اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ کسی بھی مومن صادق کے لئے:۔

منظر چمنستان کے زیبا ہوں یا نازیبا
محروم عمل نرگس مجبور تماشا ہے

کا مصداق بنا رہنا آسان نہ تھا اور بالخصوص حسین علیہ السلام تو قطعاً خاموش تماشائی بن کر یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔لہٰذا آپؑ نے اپنا فرض منصبی سمجھا کہ اس سراپا باطل نظام کے خلاف قیام فرمائیں کیونکہ آپؑ کی نظر میں دین حق کی حفاظت کی یہی ایک تدبیر تھی۔آپؑ کا قیام عقیدہ توحید کی بقاء کے لئے تھا جس میں ذاتی مفاد کا کوئی دخل نہ تھا اور نہ ہی اس کا مقصد اپنی فتح و بقاء اور دوسروں کی شکست و نابودی تھا۔کسی کے ساتھ آپؑ کو ذاتی رنجش نہ تھی۔ بلکہ یزید کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو امام حسین علیہ السلام اسی طرح اس کے خلاف بھی قیام فرماتے۔خواہ اس کا سلوک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے ساتھ اچھا ہوتا یا برا۔کیونکہ یہ ذاتیات کا مسئلہ تھا ہی نہیں۔اگر آپؑ یزید اور اس کے حامیوں اور گماشتوں کی نازیبا حرکات سے تعرض نہ کرتے۔اور خاموش رہ کر گویا ان کے غیر اسلامی تصرفات پر مہر صحت ثبت فرما دیتے تو وہ آپؑ کی ہر ممکن مدد اور خدمت پر تیار تھے۔ جو کچھ ان سے چاہتے آپؑ کو مل جاتا خواہ وہ حجاز ویمن عراق یا خراسان کی حکومت ہی ہوتی اگر یزید کی سلطنت میں کوئی اہم کلیدی عہدہ طلب کرتے تو کسی کو اختلاف نہ ہوتا اگر مال و دولت کے انبار کی خواہش فرماتے تو وہ بھی پیش کر دیئے جاتے لیکن **لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری** فرمانے والے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسےؑ نے بھی باطل کی ہر راشیانہ پیش کش کو پشت پائے استحقار سے ٹھکرا کر حسین منی کی معنوی اہمیت وصداقت کو ثابت کر دیا۔ دراصل آپؑ کی یزید کے خلاف جنگ مسلکی اور عقائدی تھی اور خالصتاً حق و باطل کی جنگ تھی اس جنگ حق و باطل میں حسین علیہ السلام ایک شخص معین کی نہیں ایک رمز اور ایک مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خود آپؑ نے اس معنیٰ کو دو لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔ اپنے ایک خطاب جلیل میں جو آپؑ نے اثنائے راہ کربلا میں اپنے اصحاب باوفا سے غالباً حر کی آمد پر کیا تھا۔ آپؑ فرماتے ہیں۔

لا تَرَوْنَ أَنَّ الْحَقَّ لا يُعْمَلُ بِهِ وَ أَنَّ الْبَاطِلَ لا يُتَنَاهى عَنْهُ، فَلْيَرْغَبَ الْمُؤْمِنُ فِي لِقَاءِ اللّٰهِ

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا نہ ہی باطل سے احتراز کیا جا رہا ہے لہٰذا مومن کو چاہئے کہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ یعنی شہادت کا طالب ہو۔

دیکھا آپ نے؟ **فلیرغب المومن** فرمایا **فلیرغب الامام** یا **فلیرغب الحسین** نہیں فرمایا۔ مطلب یہ کہ ہر مومن مخلص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ایسی صورت احوال میں عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دے کیونکہ مسلمان کو چاہئے کہ جب وہ دیکھے کہ حق پر عمل نہیں کیا جا رہا اور باطل کا بھی سد باب نہیں ہو رہا تو اس کا فرض ہے کہ اس صورت احوال کے خلاف قیام کرے اور شہادت پر کمر بستہ ہو جائے۔

میں نے یہ سب کچھ آپ سے مختصراً بیان کیا ہے اس کی تفصیل جناب آیتی بیان فرما چکے ہیں اور مزید بھی اس پر روشنی ڈالیں گے۔

آپ کی خدمت میں ہم نے قیام حسین علیہ السلام کے بارے میں تین مختلف تفسیریں پیش کیں۔ پہلی تفسیر وہ ہے جو ایک دشمن حسین علیہ السلام ہی سے ممکن ہے۔ دوسری آپؑ کے نادان دوستوں کی ہے جو یقیناً دشمنوں کی تفسیر سے خطرناک اور گمراہ کن تر ہے اور حسینی روح سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں جبکہ تیسری تفسیر خود امام علیہ السلام نے فرمائی ہے۔

آئمہ دین کی تاکید

یہ جو آئمہ دین کی طرف سے مجالس عزا کے دوام وبقا کی تاکید وارد ہوئی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ حسین علیہ السلام شخصی منفعت کی طلب میں شہید نہیں

ہوئے نہ وہ امت کے گناہوں کے فدیے میں شہید ہوئے بلکہ راہ حق میں اور باطل کے خلاف جہاد میں شہید ہوئے۔ آئمہ دین نے چاہا کہ حسینی مکتب دنیا میں زندہ رہے۔ شہادت حسین علیہ السلام ایک مکتب کی شکل میں حق کے باطل کے خلاف جہاد کے مکتب کی شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے ورنہ حسین علیہ السلام کی ذات کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم روئیں یا نہ روئیں اور خود ہماری ذات کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک جگہ اکٹھا ہو گریہ کرلیں یا جلوس کی شکل میں کوچہ و بازار میں گھومیں۔ دراصل اس سے آئمہ دین کا مقصد یہ تھا کہ قیام امام علیہ السلام ایک مکتب فکر کی شکل میں۔ایک نورانی مشعل کی شکل میں دنیا میں باقی اور قائم رہے۔ کیونکہ یہ حق وحقانیت کا ایک روشن چراغ ہے حق طلبی اور حریت وآزادی کی آواز ہے اور ظلم کے خلاف جہاد کا ایک فلسفہ ہے۔ انہوں نے چاہا کہ یہ پاکیزہ روشنی یہ آواز حق اور یہ رہنما فلسفہ زندہ جاوید رہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ دستور اعزاداری خود آئمہ دین کے عہد میں کتنا موثر رہا ہے کتنی تاکید انہوں نے شعراء کو اسے نظم کرنے کے بارے میں کی ہے اور کیسے کیسے شاعر اس مکتب نے پیدا کیے؟

اس مکتب سے کمیت اسدی اور دعبل خزاعی پیدا ہوئے جانتے ہیں یہ کون لوگ تھے؟ یہ عرف عام میں روضہ خوان ہی تھے اور مرثیہ گو شاعر تھے لیکن محتشم کاشی صاحب ہزار خواب جیسے نہیں میرا دل بہت چاہتا تھا کہ آپ کو کمیت اسدی دعبل خزاعی ابن الرومی ابوفراس حمدانی کے کچھ عربی کے اشعار سناؤں تاکہ آپ ان کا موازنہ محتشم کاشی کے اشعار سے کریں اور دیکھیں کہ

تفاوت رہ کا کتنا ہے کہاں تک ہے

وہ لوگ خالصتاً مکتب حسینی علیہ السلام کی بات کرتے ہیں۔ کمیت اسدی اپنے اشعار کے اسلحہ کے ساتھ بنی امیہ کی حکومت کے لئے ایک بکتر بند فوج سے بھی زیادہ خطرناک سمجھا گیا وہ کیا اور کیسا انسان تھا؟ کیا وہ صرف ہمارے روضہ خوانوں کی طرح

کا ایک روضہ خوان ہی تھا کہ مجلس میں آیا چار شعر پڑھے اور فیس وصول کر کے چلتا بنا؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ تو اپنے شعروں سے دنیا کو ہلا کر رکھ دیتا تھا اس کے شعروں نے تو اموی بادشاہی کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں۔ وہ یونہی تو اموی مطلق العنانیت کے لئے مسلح فوجی خطرہ نہیں بن گیا تھا۔

ایک دفعہ جناب عبداللہ بن حسن علیہ السلام بن علی علیہ السلام کمیت کے اشعار سے اتنے متاثر ہوئے انہوں نے اپنی جاگیر کا ملکیت نامہ اسے نذر کر دیا۔لیکن کمیت نے جواب دیا میرے لئے قطعاً ناممکن اور ناجائز ہے کہ اپنے اشعار کے عوض مال دینا قبول کروں۔ میں سید الشہد اعلیہ السلام کا مرثیہ خواں ہوں اور اس مرثیہ خوانی کے عوض پیسے وصول نہیں کر سکتا۔لیکن آپ کی طرف سے اصرار اتنا شدید تھا۔ کہ **الامر فوق الا دب** آخرکار اسے قبول کرنا ہی پڑا۔لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد وہ جناب عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یوں عرض گزار ہوا۔ میرا آپ سے ایک سوال ہے اگر آپ قبول کرنے کا وعدہ فرمائیں تو عرض کروں؟ آپ نے کہا ضرور مانوں گا لیکن تمہارے سوال کا پتہ تو چلے؟ کمیت نے کہا گستاخی معاف لیکن آپ وعدہ فرما دیں کہ وہ جو کچھ بھی ہے آپ منظور فرما دیں گے۔آپ نے وعدہ کر لیا بلکہ شاید قسم بھی کھائی۔تو فوراً جاگیر کا ملکیت نامہ آپ کے ہاتھ میں دیکر کہنے لگا۔ یہ واپس لے لیجئے میں اسے نہیں لے سکتا۔

ایک دفعہ بنی ہاشم نے اس کے لئے کچھ رقم جمع کی اور اسے دینا چاہی۔لیکن اصرار کے باوجود اس نے اسے قبول نہ کیا۔

اس مرد مومن نے اپنے شعروں اور مرثیہ گوئی کی وجہ سے کیسے کیسے مصائب برداشت کئے اور کتنی کڑیاں جھیلیں یہ ایک مستقل داستان ہے جو اس کی المناک شہادت پر ختم ہوتی ہے۔آخری وقت میں اسے یوسف بن عمر ثقفی حاکم کوفہ کے گھر لے گئے۔ وہاں آٹھ وحشی اس پر ٹوٹ پڑے اور تلواروں کے پے در پے ضربوں سے اسے شہید کر دیا اس کے آخری الفاظ یہ تھے **اللھم آل محمد** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **اللھم آل**

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

خدا رحمت کنا دایں عاشقاں پاک طینت را!۔

دعبل خزاعی کو دیکھیے! وہ کہا کرتا تھا میں پچاس برس سے اپنی سولی کا سامان اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا ہوں۔ یہ ہمارے الفاظ نہیں ہیں۔ معاصر مصری علماء نے ان عظیم شعراء کے بارے میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان مرثیہ گو مومنین کامل کی عظمت شان میں یہی کہنا کافی ہے کہ خود آئمہ دین نے ان کی کوششوں کو سراہا اور سند استحسان سے نوازا تھا آپ انہیں روضہ خوانوں کو کس صف میں قرار دیں گے؟

انہوں نے مرثیے ضرور کہے ہیں لیکن وہ ہمارے ہاں کے مروج مرثیوں:۔

عابد بیمار شام کا بازار طوق گرانبار
زینب ناچار مجمع فجاز ے خوار کا دربار

جیسے نہیں بلکہ رزمیہ شاعری کا شہاکار ہیں جن میں ذکر مصائب کربلا نہایت احتیاط اور تاریخی دیانت سے کیا گیا ہے ان میں ایک مرثیہ تو کسی انقلابی مفکر کے ایک پورے سلسلۂ مقالات جتنی افادیت و اہمیت کا حامل ہے جس میں ذکر مصائب کربلا کے ساتھ ساتھ بنی امیہ اور بنی عباس پر بہت گزندہ قسم کی تنقید بھی کی گئی ہے۔

متوکل کے مظالم

آپ نے سنا ہوگا کہ متوکل عباسی نے حکم دیا تھا کہ نہر فرات کو کاٹ کر قبر حضرت سید الشہداء پر سے گزارا جائے تا کہ ضریح مبارک کا نشان مٹ جائے اور کوئی شخص آپؑ کی زیارت کی سعادت نہ حاصل کر سکے علاوہ ازیں اس کے عہد نامسعود میں زائرین حسین علیہ السلام کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے اور انہیں سخت ترین عذاب وافریت سے دو چار کیا جاتا تھا حتیٰ کہ آپؑ کا نام لینے والوں کی زبانیں کاٹ دی جاتی تھیں آپ یہ خیال نہ کریں کہ متوکل صرف کسی نفسیاتی عقدے میں مبتلا تھا یا صرف حسین علیہ السلام کے

ساتھ اسے خدا واسطے کا بیر تھا؟ نہیں بلکہ حقیقت یہ تھی کہ ان دنوں عزاداری امام مظلوم کے بارے میں آئمہ دین کی تاکیدی ہدایات کے نتیجے میں لفظ حسین کمیت اسدی اور دعبل خزاعی جیسے شعراء پیدا کر کے انقلاب کی ایک قطعی رمز بن گیا تھا۔

متوکل دیکھ رہا تھا کہ ان شعرائے انقلاب میں سے ہر فرد اس کی حکومت کے لئے ایک باقاعدہ مسلح دشمن فوج کی طاقت رکھتا تھا۔اسے پورا اندازہ تھا کہ مقتول حسینؑ اس کے لئے زندہ حسینؑ سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ آئمہ دین کی ابقاء و احیائے عزاداری حسین علیہ السلام کی مسلسل کوششوں اور اس کے بارے میں تاکیدی احکام کی وجہ سے نام حسین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک آئیڈیل ایک فکر یے اور ظلم وستم اور جور واستبداد کے خلاف جہاد کی ایک رمز بن گیا تھا اس لئے متوکل نے دل ہی دل میں اس آئیڈیل اس فکر یے اس عقیدے اور اس ذکر کی بیخ کنی کی تدبیر مکمل کر لی تھی ورنہ اسے حسین علیہ السلام سے کوئی ذاتی پرخاش یا رنجش نہ تھی لیکن وہ بیوقوف نہ تھا صاف دیکھ رہا تھا کہ حسین علیہ السلام کا نام اسی ذکر مصائب کربلا کے ذریعے ایک ایسے انقلابی مکتب کی شکل اختیار کر چکا ہے کہ اگر اسے ختم نہ کیا گیا تو متوکل متوکل نہ رہے گا۔

پھر ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں کہ جب تک مرثیہ اور مرثیہ خوان حضرات نے تعلیمات آئمہ و علما کی پیروی میں حقائق تاریخیہ سے اپنی وابستگی قائم رکھی بیان واقعات ومصائب کربلا میں احتیاط کی اور تحریفات سے اجتناب کیا تو اصلاح معاشرہ کی کوششوں میں وہ انتہائی عظیم کامیابیوں سے دوچار ہوئے اور نہایت حیرت انگیز کردار انجام دیا۔میں پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عزاداری سے متعلق ہمارے موجودہ غلط طور طریقوں کے باوجود اب بھی خوش قسمتی سے ہمارے عوام کے خیالات و احساسات جناب سید الشہداء علیہ السلام کے بارے میں نہایت پاکیزہ اور قابل قدر ہیں کچھ لوگ البتہ ایسے بھی ہیں جن کی نیتوں میں تو شک نہیں کیا جاسکتا لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ عزاداری کے اس مکتب سے کماحقہ استفادہ نہیں کیا جا رہا بلکہ اسے ایک

مضحکہ بنایا جا رہا ہے تو بددل ہو کر اسے متنفر ہو جاتے ہیں اور اسے غیر مفید اور فضول سمجھ کر اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ انہوں نے سن رکھا ہے کہ اس سے گناہ بخشے جاتے ہیں ورنہ وہ کبھی گریہ وغیرہ نہ کریں۔لیکن اس میں حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ اسے ایک نیک کام اور مکتب حسینی علیہ السلام کے دوام و بقا کے لئے ضروری عمل سمجھ کر عوام کو اس کی ترغیب دی جاتی ہے اور چونکہ اس سے انسانی اور اسلامی اقدار کا احیاء ہوتا ہے اس لئے اسے باعث خوشنودی حق تعالیٰ بتا کر اس پر آمادہ کیا جاتا ہے ورنہ آپ کچھ لوگوں کو راضی کر دکھایئے کہ ایک جماعت کی شکل میں کسی جگہ جمع ہو کر نصف گھنٹہ کے لئے کسی پر مثلاً شاہ عباس صفوی ہی پر گریہ کریں لیکن آپ ہزاروں روپے دے کر بھی کسی کو اس پر آمادہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ گریہ احساس پر منحصر ہے جب تک انسان متاثر نہ ہو رو نہیں سکتا اس کے لئے یا رنج وحزن درکار ہے اور یا محبت وعقیدت۔ مسلمانوں کے دلوں میں سید الشہداء علیہ السلام کے لئے حقیقی احساسات موجود ہیں وہ بہر حال امام حسین علیہ السلام سے محبت اور عشق رکھتے ہیں اور سوز دل سے آپؑ کے مصائب پر گریہ کرتے ہیں۔ صرف محرم اور صفر ہی کے دوران منوں آنسو آپ پر بہائے جاتے ہیں۔اس مدت کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی مجالس بپا ہوتی ہیں ان میں گریہ وزاری اور اشکباری کی جاتی ہے۔ اور جب تک غم نہ ہو دکھ نہ ہو محبت نہ ہو عشق نہ ہو احساسات نہ ہوں رونا کیسے آ سکتا ہے؟۔

یہ احساسات بہت بیش قیمت ہیں لیکن اس وقت ان کے کماحقہ استفادہ نہیں کیا جا رہا اور وہ ایمان افروز نتائج اس سے حاصل نہیں ہو رہے جو بہر حال حاصل ہونے چاہئیں۔

حقیقت استفادہ

ہمارے پاس بیسیوں ایسی چیزیں موجود ہیں جن سے ہم نے ابھی تک استفادہ نہیں کیا۔ کئی پہاڑ اور دریا ایسے ہیں جن سے ہم ہنوز کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔

لیکن کیا یہ واقعی بے کار چیزیں ہیں جن کی ہمیں کوئی ضرورت و احتیاج نہیں؟ پٹرول صدیوں سے ہماری زمین کی تہوں میں موجود تھا لیکن ماضی قریب تک ہم اس سے استفادہ نہیں کر سکے تھے۔ تو کیا یہ کہنا درست ہوتا کہ پٹرول ہے ہی ایک فضول چیز! اس کے علاوہ بھی کئی قیمتی معدنیات اس سرزمین کے اندر موجود ہیں جن سے ہم نے ابھی تک استفادہ نہیں کیا تو کیا وہ سب فضول اور بے کار ہیں۔؟

میرے عقیدے میں اگر ہمارا ملک اصلاح چاہتا ہے ترقی کی راہ پر گامزن ہونا چاہتا ہے اقوام عالم میں بلند مقام کا خواہاں ہے علم وصنعت میں آگے بڑھنا چاہتا ہے اور حریت فکر اور آزادی رائے کی کوئی قدر ہماری نظروں میں ہے تو اس کے لئے بہترین اور نزدیک ترین راہ یہی ہے کہ حسین علیہ السلام جیسے صاحب مکتب عظیم انسان کے بارے میں عوام کے انہی سچے اور حقیقی احساسات سے استفادہ کیا جائے۔

قیام حسینی علیہ السلام سے استفادہ

ہمارے دین و مذہب کا دستور ایک نہایت عظیم دستور ہے جس کا اتباع ہم پر لازم ہے۔

بہرحال آج ہمارے منبر اور مجلس خوانی کی جو بھی صورت ہے سانحہ عاشورا ہی سے پیدا ہوئی ہے عزاداری حسین علیہ السلام کے ادامہ واقامت کے لئے آئمہ اطہار کی تاکیدات کا نتیجہ ہے اور عزاداری ہی کی برکات سے ہے۔ اب ہمارے عاقل وفہمیدہ طبقہ کے ذہن میں ایک تقاضا ابھر رہا ہے وہ سوچ رہے ہیں کہ اب جبکہ اقامت واحیائے عزاداری کا عمل دوام کی راہ پر چل نکلا ہے تو کیوں نہ ان بھری ہوئی روزمرہ کی مجالس سے ایک اور ضروری استفادہ نہ کیا جائے اور اضافی طور پر ایک اصولی مقصد نہ حاصل کیا جائے۔ جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے ہمارے فرائض و واجبات میں داخل ہے۔

اس طرح سے حسین علیہ السلام دو کرسیوں کے مالک ہو گئے۔ایک کرسی مرثیہ وروضہ خوانی کی جس کا اگر چہ صحیح طریقے سے اتباع نہیں ہوا۔ پھر بھی جیسے میں عرض کر چکا ہوں اس کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے اور اس سے اچھے ہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اور دوسری کرسی آپؑ کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے ہم شیعان علیؑ میں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سارا عمل حسین علیہ السلام کے نام ہی سے انجام پاتا ہے کیا ہی مبارک کام اور کتنا ہی متبرک یہ رجحان ہے کہ کرسی عزائے حسین علیہ السلام ضمناً امر بالمعروف نہی عن المنکر اور تعلیم اصول وفروغ دین کی مسند بھی بن گئی ہے۔عوام کے بنیادی انسانی احساسات سے یہ استفادہ یقیناً قابل تبریک ہے۔

لوگ جتنی تعداد میں حسین علیہ السلام کے نام پر اکٹھے ہوتے ہیں غالباً کسی اور نام پر اتنا انسانی اجتماع نہیں ہوتا۔ اہل دانش حضرات کی یہ سوچ بڑی مستحسن ہے لیکن اس پر عمل کی نوعیت کیا ہو یہ ہر اہل منبر کی ذاتی لیاقت اور حسن تدبیر پر منحصر ہے یہ اس کا کام ہے کہ خواہ اصول عقائد بیان کرے ضروریات و بدیہیات دین کا ذکر کرے۔ پندونصائح کی بات کرے حلال و حرام سے آگاہ کرے یا دینی و دنیاوی مصالح سمجھائے۔ سامعین کو بہر حال نام حسین کی برکت سے ہمہ تن گوش پائے گا۔بہر حال اپنے پیغام کو اپنے سامعین کے ذہن نشین کرنے میں کامیابی خالصتاً اس کی ذاتی لیاقت و صلاحیت پر منحصر ہے۔

ان حقائق کی بنا پر یہ کہنا یقیناً درست ہے کہ آج ہمارے اہل منبر کی جملہ سرگرمیوں کا منشا ومولد سانحہ کربلا ہی ہے اور ہم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مبداء کی حفاظت کا سب سے اہم مرکز ہمارا منبر ہے جس کی رونق ذکر معصومین اور نام حسین علیہ السلام ہے۔

اب جب کہ احوال یہ ہے تو ہمیں عزاداری کے بارے میں بھی سوچنا چاہیئے اور اس میں جو خامیاں نظر آتی ہیں ان کی اصلاح کی تدبیر کرنا چاہیئے۔ مرثیہ خوانی

کے نکتہ نظر سے بھی اور عوام کی ہدایت وارشاد کے زاویہ نظر سے بھی۔ مثلاً

ا۔ اول الذکر نکتہ نگاہ کے مطابق اہل منبر کو فلسفہ قیام حسین علیہ السلام اور عزاداری کے بارے میں آئمہ اطہار کے احکام وفرامین پر اپنی توجہات کو مرکوز کرنا چاہئے اور بار بار انہیں اپنے سامعین کے گوش گزار کرنا چاہئے تا کہ وہ انہیں باقاعدہ ذہن نشین ہو جائیں۔

علاوہ ازیں متکلمین کو بھی پوری بصیرت و احتیاط سے انقلاب حسینی کے مستند حقائق بیان کرنا چاہئیں اور ان کی معلومات میں تبحر یا کم از کم کافی وسعت ہونی چاہئے نہ کہ وہ کسی عوامی شاعر کے جنگ نامے میں مذکور افسانوں تک محدود ایک دوسرے سے سنے سنائے مجمع بازانہ ٹوٹکوں پر منحصر ہوں۔ مثلاً اگر یہ پوچھا جائے کہ جناب آپ نے فلاں بات کس سند سے بیان کی ہے تو اگر جواب یہ ہو کہ فلاں لسان الذاکرین یا فلاں صدر الواعظین سے سنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے کتاب ملاحظہ فرمانے کی زحمت کشی کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ اس ضمن میں داستانیں تو بے شمار بیان کی جاسکتی ہیں جو اگر طوالت بیان کا اندیشہ نہ ہوتا تو بطور نمونہ آپ کی خدمت میں ضرور پیش کی جاتیں جن سے آپ کو اندازہ ہو جاتا کہ کس طرح سے ایک روضہ خوان کی گھڑی ہوئی روایت جنگل کی آگ کی تیزی سے دوسرے روضہ خوانوں میں محلہ بہ محلہ قریہ بہ قریہ شہر بہ شہر حتیٰ کہ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل جاتی ہے۔ اس بارے میں ایک مثال مجلس دوم میں بیان ہو چکی ہے۔

تاریخی واقعات کو ہمیشہ معتبر کتب تاریخ یا معتبر مورخین کے حوالے سے بیان کرنا چاہئے۔ یہی علامہ آیتی صدر اسلام کی تاریخ کے بھی مورخ ہیں اور میں پورے یقین و اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ پورے تہران یا شاید پورے ایران اور برعظیم پاک و ہند میں نہیں رکھتا اور اسلامی تاریخ کے اس ابتدائی حصے کی جزئیات سے کوئی بھی شخص ان کے برابر واقف و مطلع نہیں ہے۔ اس مرد اعلام کو اس عہد کی تمام تواریخ کے

متون پر پوری دسترس اور عبور حاصل ہے اور ان کی دقیق جزئیات پر ان کی نظر بہت گہری اور رسا ہے۔ مثلاً اگر جنگ بدر کے بارے میں آپ نے ان سے سوال کیا تو اس میں شریک ایک ایک فرد کا نام بتائیں گے اور بعض اوقات تو اس کے والد والدہ اعزا واقارب حتیٰ کہ اس کا نسب تک آپ کو بتا دیں گے جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے سند کا درجہ رکھتا ہے۔لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمیں حقیقی باتیں سننے کی عادت نہیں ہے۔ان کی آخری تالیف جسے تہران یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔تاریخ اندلس ہے بہت عظیم الشان کتاب ہے جو ایک بہت بڑے اسلامی حادثہ کے بارے میں تحریر کی گئی ہے مسلمانوں اور بالخصوص ہم نے اس تاریخی حادثے کے موضوع میں بہت ہی کم دلچسپی لی ہے آپ کو چاہئے کہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔

بہرحال یہ لازمی ہے کہ فلسفہ قیام حسینی علیہ السلام کو بار بار منبر پر بیان کیا جائے اور فلسفہ عزاداری پر روشنی ڈالی جائے تاکہ وہ مقصد حاصل ہو جائے جس کے حصول کی تاکید امام زین العابدین امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام نے فرمائی ہے اور ایک بار پھر ہم میں کمیت اسدی اور دعبل خزاعی جیسے کامل الایمان انقلابی شاعر پیدا ہوں جو اپنے پرتاثیر کلام سے عزاداری کے فلسفے کو فروغ دیں۔

ایسا کوئی بھی قدم ہرگز نہ اٹھایا جائے جو عزاداری کے بارے میں عوام کے احساسات پر منفی اثر ڈالے بلکہ انہیں مزید تقویت دینے کی ضرورت ہے۔ ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں جن سے عوام میں حق کی راہ میں ایثار وقربانی اور باطل کے خلاف نفرت و جہاد کے جذبات واحساسات فروغ پائیں۔

جیسا کہ آیت اللہ بہشتی نے فرمایا حق و باطل کی جنگ ہمیشہ سے دنیا میں برپا رہی ہے۔جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

موسیٰ علیہ السلام و فرعون ابراہیم علیہ السلام ونمرود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ابوجہل علی علیہ السلام معاویہ حسینؑ و یزید تاریخ کے ہر دور میں دنیا میں موجود رہے ہیں اس کا معنیٰ یہ نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام عیسی علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے مقام ومرتبہ کے افراد ہر زمانے میں بنفس نفیس دنیا میں موجود رہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی علیہ السلام اور حسین علیہ السلام حق کی اور نمرود فرعون ابوجہل معاویہ اور یزید باطل کی رمز ہیں جس سے کوئی دور خالی نہیں رہا۔ لہٰذا اول الذکر کے نقش قدم پر چلنے والے حق کے طرفداروں کو مجازاً حق اور باطل کے پیروکاروں کو مجازاً باطل کہا گیا یہاں تک ہمارا بیان بحث کے پہلے حصے یعنی مرثیہ خوانی کے بارے میں تھا۔

اب ہم دوسرے حصے یعنی ہدایت و ارشاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور غور کرتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

میرے خیال میں ہمیں اس دستور پر جو خطبہ جمع کے بارے میں بیان ہوا اور جس کے ضمن میں گزشتہ شب حضرت رضا علیہ السلام سے ایک روایت بھی نقل کی گئی عمل کرنا چاہیے کیونکہ وہ ایک جامع دستور ہے۔

ہمارے ہاں ہر گلی کوچہ میں نماز جمعہ نہیں ہوتی کہ اس دستور سے خطبہ جمعہ میں استفادہ کرسکیں لہٰذا ہمیں چاہئے کہ حسین علیہ السلام کے نام سے بپا ہونے والی مجالس اور دیگر اجتماعات میں منبر کو اس مقصد کے لئے استعمال کریں اور اپنے خطبوں تقریروں اور مجلس خوانی کے دوران اس دستور کی اہمیت پر روشنی ڈالیں اور اس سے استفادہ کریں۔

گزشتہ شب جو روایت میں نے حضرت رضا علیہ السلام سے بیان کی خطیب کے فرائض کو ان تین حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔

۱۔ پندوموعظت۔

۲۔ تعلیم مصالح دینی ودنیوی۔

۳۔اطلاع امت براحوال مسلمانان عالم۔

پندوموعظت:۔

انما جعلت الخطبة یوم الجمعه لان الجمعة مشهد عام فارادان یکون لائیرسبب الی موعظتهم و ترغیبهم فی الطاعة وترهیبهم من المعصیة۔

جمعہ کے روز خطبہ اس وجہ سے لازم کیا گیا کہ وہ دن عوامی اجتماع کا ہوتا ہے جس میں امیر مسلمین کو موقعہ ملتا ہے کہ عوام کو پندونصائح کرے اطاعت الٰہی کی انہیں ترغیب دے اور معصیت خداوندی سے انہیں خوف دلائے۔

چنانچہ پہلا فرض منبر سے وعظ ونصیحت کا ہوا۔وعظ ونصیحت جیسا کہ میں نے گذشتہ شب عرض کیا خطاب کا ایک انداز ہے جو سامعین کے دلوں کو نرم کرتا ہے اوران کی سختی اور اثر ناپذیری کو زائل کرتا ہے۔قوت غضبی اور قوت شہوی کو اعتدال پر لاتا نفسانی خواہشات کی آگ کو بجھاتا اور دل کو صفا وجلا دیتا ہے۔دنیا میں کوئی شخص بھی موعظت سے بے نیاز نہیں ہے۔نہ کوئی انسان معاشرہ ہی ایسا موجود ہے جسے اس کی ضرورت واحتیاج ہو۔لیکن جو موعظہ براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے صرف دین ہی کے حوالے سے اس میں یہ خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔یہ دینی مواعظ ہی ہیں جو دلوں پر اثر انداز ہوکر ان میں خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا کرتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر کہ موعظہ دینی زبان میں بیان کیا جائے۔واعظ پر لازم ہے کہ خود بھی اپنے الفاظ سے متاثر ہواور نہ دل سے موعظت کا فریضہ بجالائے۔

یادرکھیے کہ دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں جسے موعظت کی ضرورت نہ ہو۔یہ تو ممکن ہے کہ انسان کسی دوسرے انسان کی تعلیم سے بے نیاز ہو لیکن موعظت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی بات کا علم حاصل کر لینا ایک بات ہے لیکن کسی واعظ

مومن و متقی کی نصیحت سے متاثر ہو کر حقیقت علیا سے ہم آہنگ ہونا دوسری بات ہے۔

کہتے ہیں کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے ایک دفعہ اپنے ایک اصحابی سے فرمایا۔

عظنی مجھے نصیحت کرو آپؑ فرمایا کرتے تھے سننے میں ایک اثر ہے جو جاننے میں نہیں۔

معاشرے میں وعظ و نصیحت ایک لازمی ضررت ہے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی جماعت جو اس کی اہلیت رکھتی ہو عوام کی ہدایت کے لئے موجود رہنی چاہئے۔ جو ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد کو تازہ رکھ سکے۔ انہیں موت سے غافل نہ ہونے دے۔ انہیں ان کے گناہوں سے خبردار رکھے قبر و قیامت کا ذکر ان سے کرتی رہے اور انہیں عدل خداوندی کی طرف متوجہ رکھے۔

یہ ایک نہایت ضروری امر ہے جس سے معاشرہ کبھی اور کسی بھی حالت میں بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ماضی میں ہمارے پاس بڑے بڑے واعظین اکرام تھے۔ اسی چودھویں صدی میں مرحوم حاج شیخ جعفر شوستری اور مرحوم حاج شیخ عباس قمی اعلی اللہ مقامھما جیسے عظیم واعظین ہم میں موجود تھے۔ اللہ کے فضل و کرم سے آج بھی ہمارے پاس بہت اچھے واعظ موجود ہیں لیکن معاشرے کی اصلاح کے لئے ہمارے پاس جتنے بھی جامع الشرائط ہوں کم ہیں۔ کیونکہ وعظ و نصیحت کا کام صرف منبر ہی سے صحیح طور پر انجام پا سکتا ہے۔

۲۔ تعلیم مصالح دینی و دنیوی:۔

''توقیفھم علیٰ ما راد من مصالح دینھم ودنیاھم''

مسلمانوں کو ان کے دینی اور دنیاوی مصالح پر مطلع رکھے اور ان کے لئے خیر دین و دنیا کے حصول کی قابل عمل راہیں متعین کرے۔

یہ کام بہت بڑا ہے اور وعظ و نصیحت سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ وعظ

ونصیحت تو ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو خود اہل عمل صاف دل صاحب ایمان اور عالم اوامر ونواہی ہو۔ بلکہ ایک اہل عمل و اخلاص انسان صرف بزرگان دین کے فرامودات ہی کو دھرا کر بھی موعظت کا فریضہ انجام دے سکتا ہے لیکن عوام کو ان کے دینی اور دنیاوی مصالح سے آگاہ کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس کے لئے دو کڑی شرطیں ہیں جن پر پورا اترنا آسان نہیں۔ پہلی شرط تجر علمی اور دوسری شرط اخلاص تبلیغ ہے۔

ا۔ تبحر علمی

اس کام پر مامور شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے دین کی پوری معرفت حاصل ہو اصول وفروع دین کا وہ بڑا عالم ہو۔ تعلیمات اسلامی کی روح سے پوری طرح آگاہ ہو۔ دینی و دنیوی مصالح کی مکمل اطلاع رکھتا ہو اور اسلام کے ظاہر و باطن اور اس کے جوہر وعرض سے خوب واقف ہو۔

۲۔ اخلاص تبلیغ

یہ تبحر علمی کا عملی پہلو ہے کیونکہ دینی مصالح کی تعلیم کے لئے صرف علوم دین کی معرفت ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ لیکن اس کے لئے انسان کو اخلاص کے بھی بلند ترین مرتبے پر فائز ہونا چاہئے تا کہ وہ پوری راست گوئی سے کام لے اور سچ کے سوا کچھ نہ کہے تا کہ اس کی فہمائش سیدھی دلوں میں اتر سکے۔ نیز انسانی معاشرہ کی پوری پوری شناخت اور اوضاع واحوال عالم سے مکمل آگاہی بھی اسے حاصل ہو تا کہ دنیا کے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی مدوجذر کے سامنے مسلمانوں کے موقف کی تعیین کر سکے جس سے ان کے مصالح محفوظ رہیں۔

لیکن بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ دوسری شرط پر بخوبی پورا نہیں اتر پا رہے بلکہ اس میں کافی کمزور بھی ہیں۔ وعظ ونصیحت کے میدان میں ہم

اتنے کمزور نہیں رہے اور اب بھی زیادہ کمزور نہیں لیکن صلاحیت تبلیغ کا ہم میں بہت فقدان ہے اور عالمی سیاسی اور اقتصادی تصورات سے ہم نابلد ہیں۔ اس بارے میں امام رضا علیہ السلام کا فرمان بہت قیمت واہمیت کا حامل ہے۔فرماتے ہیں۔

''عوام کو دین ودنیا کے مصالح سے آگاہ کرو''۔

جس شخص کا سروکار صرف کتابوں سے ہو اور وہ مدرسہ میں گوشہ نشین ہو اسے مدرسے سے باہر کی سرگرمیوں سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی کیونکہ مدرسے کے کونے میں گھسا ہوا شخص معاشرے کے مصالح کو نہیں سمجھ سکتا اس کے لئے بڑے قریبی مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت تیز قوت شامہ اس کے لئے درکار ہوتی ہے تا کہ مستقبل میں رونما ہونیوالے واقعات کی پیش بینی کی جاسکے اور ان کے مقابلے میں معاشرے کی اس طرح رہنمائی کی جائے کہ وہ کسی خطرے سے دوچار نہ ہو جائے۔

ہدایت کی حقیقت

ہم نے عام طور پر ہد''ہدایت'' کا لفظ سنا ہے۔خود بھی ہم نہ صرف اس لفظ کو عموماً اپنی روزمرہ کی بات چیت میں استعمال کرتے ہیں بلکہ عوام کی ہدایت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔لیکن کبھی ہم نے سوچا بھی کہ آخر یہ ''ہدایت'' ہے کیا چیز؟ اس کا لغوی معنیٰ راہنمائی ہی ہے مثلاً ایک قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں ہے اثنائے راہ میں اہل قافلہ کسی سے اپنی منزل کا پتہ پوچھتے ہیں۔جس کے جواب میں وہ انہیں کسی طرف جانے کا مشورہ دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قافلے کی رہنمائی کون کرسکتا ہے؟ کیا وہ شخص کہ جو نہ قافلے کی منزل کو جانتا ہے۔نہ وہاں تک پہنچنے کی راہ کا اسے پتہ ہے؟

ہرگز نہیں بلکہ راہنمائی کا فریضہ صرف وہی انسان انجام دے سکتا ہے جو منزل کو بھی جانتا ہو اور اس تک جانے والی راہ سے خوب واقف ہو۔معاشرہ بھی ایک قافلے کی شکل میں ہمیشہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے اور اس میں کسی فرد معاشرہ

کی رضا یا عدم رضا کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہمیں علم ہونا چاہئے کہ اس قافلے کو کیسے چلائیں اور کس طرح سے اس کی راہنمائی کریں اور جس طرح گاڑی کے ڈرائیور کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھ میں ہو اور گاڑی مکمل طور پر اس کی تحویل و اختیار میں ہوتا کہ جہاں ضرورت سمجھے اس کا انجن بند کر کے اسے روک دے جہاں مناسب سمجھے اس میں پٹرول بھرے نیز اسے معلوم ہو کہ اسٹیرنگ کب اور کہاں اور کس طرح گھمانا ہے گیئر کہاں بدلنا ہے بریک کہاں لگانی ہے۔؟

معاشرے کی رہنمائی کے لئے بھی کسی ہادی کا وجود لازمی ہے جو اس کے لئے خط عمل معین کر سکے اس کی سب مصلحتوں کا دانا ہو اس کے جملہ امور کے ادارے کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کرنے کا مجاز ہو۔

تاوقتیکہ ہمیں معاشرے کی رہنمائی کے تمام اصول وقواعد کا علم نہ ہو اور یہ پتہ نہ ہو کہ اسے کس منزل پر لے جانا ہے کون سی راہ اس کے لئے قریب تر اور محفوظ تر ہو گی۔ وہ راہ کیسی ہے اس کے پیچ وخم اس کے نشیب وفراز کیسے اور کہاں کہاں ہیں۔ اس کی رہنمائی ہمارے لئے ممکن نہ ہو گی۔ کیونکہ معاشرے کا قافلہ ہر وقت حرکت میں ہے بعض اوقات اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے کسی موڑ پر اس کے لئے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں ان سب حالات میں تاوقتیکہ ہم میں راہنمائی کی حقیقی صلاحیت نہ ہوگی ہمارے لئے اپنے قافلے کو بخیر وعافیت نکال لے جانا ممکن نہ ہوگا اب جب کہ ہمارا معاشرہ اور بالخصوص ہماری نئی نسل ایک نئی صورت حال سے دوچار ہے ایک نئے تمدن سے روبرو ہے جو مشرقیت اور مغربیت کا ملغوبہ ہے ہماری نئی نسل ایک دوراہے پر کھڑی ہے سامنے دشمن طاقتیں دیوار بنی ہوئی ہیں یہ بڑا نازک مقام ہے جس سے بخیر وعافیت گزر جانا ازحد ضروری ہے تاکہ سوئے منزل اپنا سفر جاری رکھ سکیں یہاں سے آنکھیں بند کر کے اور اس پیچیدہ صورتحال سے بے پروا ہو کر پہلی ہی سمت میں چلتے جانا

یقیناً مناسب نہیں۔آگے راہ میں کوئی دیوار نہیں تھی اب ہے!۔ پہلے رستہ صاف تھا اب اس میں رکاوٹ موجود ہے۔کچھ معلوم نہیں یہ کون سا مقام ہے!۔

یہاں رہبر کامل کی ضرورت ہے جو بصیرت کامل اور حکمت عملی سے سمت کی ماہرانہ عارضی تبدیلی سے اس قافلے کو اس مشکل مرحلے سے نکال لے جائے تا کہ وہ سوئے منزل اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔ یہی راہ ایک میدان مسابقہ سے بھی گزرتی ہے۔اس میں دنیا کے مختلف معاشرے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ہمیں اپنی قوت وسرعت میں اضافہ کرنا چاہئے۔

آج ساری دنیا صنعت وحرفت کی گھڑ دوڑ کا میدان بنی ہوئی ہے۔اس میں بھی پیچھے رہ جانا ذلت اور ابدی احتیاج کے گڑھے میں گر جانے کے مترادف ہے اس کے لئے بھی پوری قوت جمعی سے جدوجہد لازمی ہے تا کہ کم از کم دوسرے معاشروں کے شانہ بشانہ ہی چلا جا سکے۔

اس صورت حال میں تنقید نکتہ چینی اعتراض وغیرہ کو ''ہدایت'' کا مبارک نام دینا بہت ہی بڑی گمراہی ہوگا۔

کیونکہ

مجھے نگاہ تعجب سے دیکھنے والو!
جو نکتہ چین ہوں وہ نکتہ داں نہیں ہوتے

ہادی دین کی حقیقت

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک روز جب مرو کے مدرسے میں اپنے رفقاء درس سے اسی موضوع پر میری بحث جاری تھی تو اثنائے بحث میں میں نے کہا۔''دوستو!ہادی ہونے کا مطلب یہی نہیں کہ انسان ہر کام کو روکنے اور اسے ناجائز قرار دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے اور جب بھی جہاں بھی کسی کو کسی کام میں مصروف دیکھے تو اس پر اعتراض کرے اور نہی کا حکم لگا دے حالانکہ بعض مقامات پر اعتراض کی بجائے حوصلہ

افزائی اور ہمت شکنی کی بجائے ترغیب وتشویق ضروری ہوتی ہے۔ میں نے گاڑی ہی کی مثال دیتے ہوئے کہا: معاشرہ ایک گاڑی کی مانند ہے۔جس طرح ڈرائیور کو پتہ ہوتا ہے کہ گاڑی کو کب پٹرول دینا چاہئے کہاں سٹیرنگ گھمانا چاہئے کہاں موڑ کاٹنا چاہئے کہاں بریک لگانا چاہئے اور کہاں بتی جلا کر اشارہ دینا ضروری ہے۔ ہر موقعے کا اپنا جداگانہ تقاضا ہوتا ہے پھر میں نے مذاق سے کہا: معاشرے کی گاڑی کے لئے محض بریک ہی نہیں بن جانا چاہئے کہ ہمارا کام بس چلتی ہوئی گاڑی کو روکنا ہی ہو بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے کبھی سٹیرنگ بھی بن جانا چاہئے تا کہ گاڑی آگے کو بھی حرکت کر سکے۔

اس پر ہمارے ایک دوست بولے: آپ جو چاہیں بنیں میں تو صرف ریورس گیئر ہی بنوں گا۔ یہ ایک طنز تھی جس سے ہم سب محظوظ ہوئے۔

مطلب یہ ہے کہ ''ہدایت'' کا مطلب صرف نکتہ چینی یا اعتراض سے چلتے ہوئے کاموں کو روکنا ہی نہیں بلکہ موقع ومحل کی مناسبت سے اگر بعض اوقات انہیں روکنا ضروری بھی ہو تو دوسرے مقامات پر ان کی رفتار میں اضافے کی بھی تدبیر کرنا چاہئے۔

بہرحال موقعہ ومحل کی تشخیص کے لئے بڑے تبحر علمی اور وسعت اطلاع کی ضرورت ہے اور معاشرے کی قیادت وہی انسان کر سکتا ہے جو ہر مشکل صورتحال پر اپنے حسن تدبیر سے قابو پالے اور ہر فرصت سے استفادہ کر سکے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

ان لربکم فی ایام دھر کم نفحات الافتعرضوا لھا۔

نسیم رحمت خداوندی کے جھونکے آتے ہی رہتے ہیں تم ان کی تاک میں رہو اور ان سے فائدہ اٹھاؤ۔

فرصتیں اور موقعے واقعی بادنسیم کے جھونکوں کی طرح ہوتے ہیں اگر ایک جھونکا کھو دیا گیا تو وہ کسی صورت واپس نہیں آئے گا اور پھر آئندہ جھونکے کا انتظار کرنا پڑے گا لیکن کیا معلوم وہ کب آئے اور یا آئے بھی تو بہت تاخیر سے آئے۔ ہماری حالت

وقت سے فائدہ بری کی صلاحیت سے محرومی کی وجہ سے واقعی قابل افسوس ہے کہ ہم نسیم رحمت الٰہی کے جھونکوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔

مادہ پرست یا نام نہاد مذہبی لوگ کتنے ہوشیار ہیں کہ ہماری ہی سرزمین میں ہمارے اجتماعی محاذوں پر قابض ہوتے جا رہے ہیں اور نتیجتاً تمام حساس مراکز ہمارے ہاتھوں سے یکے بعد دیگرے نکل رہے ہیں۔ وہ لوگ اپنے حسب خواہش اپنے مقاصد حاصل کرتے جا رہے ہیں اور ہم اپنے چلتے ہوئے کاموں میں بھی روڑے اٹکاتے ہیں اور اپنے اختیارات اور اپنے اختیارات کی نمائش یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ یہ ٹھیک نہیں وہ درست نہیں۔ کے الفاظ سے جا و بیجا کرتے رہتے ہیں۔

ایک شکایت میری زبان پر آ رہی ہے جسے میں آج اسی منبر سے آپ حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اسی سال تین شعبان سے دو تین روز پہلے یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے ایک نے جو ٹیچرز کالج میں بھی پڑھاتے ہیں ٹیلی فون پر مجھ سے فرمایا کہ ٹیچرز کالج میں سوم شعبان کو ولادت جناب امام حسین علیہ السلام کے موقعہ پر ایک جشن کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لہٰذا میں بھی حاضر ہو کر جشن مذکور سے خطاب کروں۔ میں نے چند وجوہ بیان کر کے معذرت چاہی جن میں سے ایک وجہ کام کی زیادتی اور مصروفیت بتائی۔ لیکن درحقیقت معذرت کی وجہ یہ تھی کہ میں نے سوچا بہت بڑا کالج ہے بہت سے مغرب زدہ طلبہ ہوں گے اور بے پردہ طالبات بھی ہوں گی۔ لہٰذا میری موجودگی کے لئے وہاں مناسب ماحول نہ ہوگا۔ لیکن ان بزرگوار نے ٹیلی فون پر بہت زیادہ اصرار کیا اور فرمایا آپ کو انکار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ہمیں تبلیغ حق کے لئے ایک نیا محاذ مل رہا ہے۔ طلبہ کی تازہ قائم شدہ دینی انجمن کے ارکان نے بڑی کوشش کے بعد کالج کی انتظامیہ کو اس جشن کے انعقاد پر راضی کیا ہے آپ کو ضرور آنا چاہئے۔''

میں رات کو جشن میں حاضر ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے وہاں جا کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ بڑا شاندار جشن تھا۔ جس میں آپ حضرات میں سے جو یہاں تشریف فرما

ہیں قریباً ۲۰۰ افراد ضرور موجود تھے۔ جو میری معروضات کے عینی شاہد ہیں۔ دو روز ناموں نے بھی جشن کی تفصیلات شائع کیں اور جو حضرات اس جشن میں موجود نہ تھے انہوں نے اخباروں میں اس کی کارروائی ضرور ملاحظہ فرمائی ہوگی۔

کچھ حضرات نے وہاں تقریریں بھی فرمائیں۔ میں نے بھی نصف گھنٹہ حاضرین سے خطاب کیا ایک چیز جس نے مجھے اور سب حاضرین کو خاص طور پر متاثر کیا یہ تھی کہ خواتین اور طالبات نے اس جشن کے لئے باقاعدہ چندہ دیا تھا اور اس کے اخراجات میں شریک ہوئی تھیں اور مذہبی جشن میں پورے احترام سے مکمل طور پر حجاب شرعی کے ساتھ آئی تھیں۔ ان کے لئے جلسہ گاہ میں الگ جگہ مخصوص کی گئی تھی جو اوپر کی منزل میں تھی۔اس کے باوجود ان کی نشست گاہ کے سامنے پردہ تنا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ مکمل طور پر نظروں سے اوجھل تھیں۔ ان کی آمدورفت کی راہیں بھی مردوں سے بالکل الگ بنائی گئی تھیں۔ میں نے صرف ایک طالبہ کو دروازے پر کھڑا پایا جو پوری طرح پردے میں تھیں لیکن جشن کے اندر کسی طالبہ کو موجود نہیں پایا۔ طالبات نے احتیاطاً اپنے پاس ایک چادر فالتو رکھی ہوئی تھی کہ اگر اتفاق سے کوئی بے حجاب خاتون وہاں آ جائیں تو چادر پیش کر کے ان سے پردے کی درخواست کی جائے۔

یہ صورت حال یقیناً دینی اقدار وتعلیمات کی فتحیابی کی علامت اور مور دصد شکر تھی۔ جلسے میں جو مقالے پڑھے گئے ان میں سے ایک مقالہ طالبات نے تحریر کیا تھا جسے ایک طالب علم نے پڑھ کر سنایا۔ مقالے کا موضوع بھی اسلام کی طرف سے عطا شدہ حقوق زن تھا۔جس میں کہا گیا تھا کہ اگر کسی دن کو روز آزادی نسواں قرار دیا جا سکتا ہے۔تو وہ روز بعثت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اور کوئی نہیں اور ضمناً اس میں حجاب اسلامی کی مخالف ان عورتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا جو آزادی نسواں کے حق میں دھواں دھار تقریریں کرتی اور خود کو ان کا نمائندہ بتاتی ہیں مقالے میں ان کو وکلائی بے موکل قرار دے کر ان کے رسمی وجود سے انکار کیا گیا تھا یہ سب باتیں روز ناموں میں تفصیل سے

شائع ہوئیں۔

میرے خیال میں دینی نکتہ نظر سے یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا اور یقیناً ایک محاذ فتح ہوا تھا۔

پردے کے نکتہ نظر سے اس جلسہ میں شریک خواتین کی وضع مجالس روضہ خوانی میں بلکہ بڑے بڑے آیت اللہ حضرات کی منعقدہ مجالس عزا میں شریک ہونیوالی خواتین کی وضع سے بدرجہا بہتر اور محفوظ تھی۔ اس جشن کو مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہی گزرا ہوگا کہ رمضان المبارک میں میں نے سنا کہ ایک بہت مشہور واعظ نے ایک بہت بڑی مجلس میں منبر پر سے اسلام کی دہائی دیتے ہوئے فرمایا۔

انہیں شرم نہیں آتی۔ دینی انجمنیں بناتے ہیں تاکہ دین کے نام
پر مرد وزن باہم یکجا ہوسکیں اور اس پر مستزاد یہ کر پردے سے
بے نصیب لڑکیاں دینی تقریریں کرتی ہیں۔''

میں یہ الفاظ سن کر شرم اور حیرت میں غرق ہوگیا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان الزامات کو کس چیز پر محمول کروں زیادہ سے زیادہ خوش فہمی یا بے خبری پر محمول کر سکتا ہوں۔لیکن ہماری طرف سے ایسی غفلت اور بے خبری کا کیا جواز ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ الفاظ کسی خاص غرض سے کہے گئے ہوں۔

ٹیچرز ٹریننگ کالج یعنی کلیہ تربیت اساتذہ جہاں سے ایک استاد کو فارغ التحصیل ہوکر ہزاروں انسانوں کو تعلیم دینا ہے یعنی جہاں کا ایک فرد ہزار افراد کے برابر ہے۔ کیا ایسی جگہ اسلام کو نفوذ کرنا چاہئے یا نہیں؟ اگر یہ علامہ صاحب اخبار ہی پڑھ لینے کی زحمت فرما لیتے یا حاضرین میں سے کسی سے حقیقت حال دریافت فرما لیتے تو شاید ایسے نازیبا کلمات سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے لیکن ہم نے کبھی اپنا محاسبہ نہیں کیا کہ ہم ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں اور کیوں واقعات کو مسخ کرتے وقت ہمارا ضمیر خاموش رہتا ہے؟

"وتوقیفھم علی ماأراد من مصلحتہ وینھم ودنیاھم"۔

کا یہی معنی ہے؟ کیا ان الفاظ سے یہ مراد ہے کہ ہمیں ایسے کام کرنا چاہئیں جو دشمنان اسلام کو خوش کریں اور انہیں بغلیں بجانے کے موقع پر فراہم کریں؟

دراصل ایسے لوگوں کی خواہش یہ ہے کہ تدین جاہلوں اور بے سوادوں ہی تک محدود رہے۔ انہیں ہرگز گوارا نہیں کہ دین ان حدود سے باہر نکل کر اہل علم تک پہنچ جائے۔ کیونکہ انہیں خوف معلوم ہے کہ مستقبل بہرحال صاحبان علم وفضل اور اہل دانش ہی کی میراث ہے۔ اور ''کل'' کے مالک وہی ہوں گے جو آج یونیورسٹیوں اور بڑی بڑی درس گاہوں میں زیر تعلیم ہیں جب کہ بے سوادوں کے دن گنے جا چکے ہیں اور ان کی جنس رفتہ رفتہ نابود ہو رہی ہے اور اب تو نانبائیوں اور خوانچہ فروشوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ دراصل انہیں اندیشہ لاحق ہے کہ جب جاہل باقی نہ رہے تو ان لوگوں کی گرم بازاری کیسے باقی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتے کہ دین اہل علم کے حلقوں تک رسائی حاصل کر لے کیونکہ وہاں جا کر وہ مصفیٰ ہو جائے گا اور ایک بار پھر اپنی صحیح فطری شکل اختیار کر لے گا جس سے ان کی دنیداری اور دین دانی کی قلعی کھل جائے گی۔

بہرحال کوئی چاہے یا نہ چاہے مستقبل کے مالک یہ اہل علم ہی ہیں اگر ہم آپ علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق موقعہ وفرصت سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ایسی درس گاہوں اور یونیورسٹیوں کے قیام کی کوشش کریں۔

فرمان معصومؑ

وتوقیفھم علی ماارادمن مصلحتہ دینھم دنیاھم۔

جس سے مراد یہ ہے کہ عوام کو ان کی دینی اور دنیاوی مصلحتوں

سے آگاہ کیا جائے کی تعمیل کی دوضروری شرطیں علم اور اخلاص ہیں
جن میں سے علم کی پھر دو شاخیں ہیں: علم دین اور علم دنیا (یعنی
عالمی سیاسی اجتماعی اور اقتصادی اوضاع واحوال کا علم)۔

اخلاص

حاجی نوری رحمۃ اللہ علیہ نے جو کتاب ''لولوو المرجان'' لکھی ہے میں نے اس کے بارے میں سنا تو بہت تھا لیکن اس کے مطالعہ کا موقعہ اسی سال مجھے ملا۔ یہ کتاب مرثیہ اور مرثیہ خوانی کے بارے میں ہے اور واعظ وعظ خطبہ یا خطیب کے موضوع پر اس میں کوئی مواد موجود نہیں۔ انہوں نے روضہ خوانی اور مرثیہ خوانی کے لئے دو چیزوں۔ اخلاص اور راست گوئی۔ کو لازمی شرط قرار دیا ہے اور ان پر عظیم الشان سیر حاصل بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب مجھے بہت اچھی لگی اور مصنف مرحوم کے بارے میں جو مرحوم شیخ عباس قمی کے استاد اور تقویٰ و تدین کے بلند مراتب پر فائز تھے۔ میری عقیدت وارادت میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ خود مرحوم شیخ عباس قمی معترف تھے کہ ان کے علم و فضل کی شیخ نوری کے تبحر علمی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ اس سے پہلے میں ان کی دوسری تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کے لئے عقیدت پہلے سے ہی موجود تھی لیکن اس چھوٹی سی کتاب کے مطالعہ سے میرے دل میں ان کی عقیدت و احترام میں بہت ہی اضافہ ہوا۔

اس کتاب کے مقدمے میں مصنف علام نے ہندوستان کے ایک عالم کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جس میں موصوف نے ہندوستان میں رائج روضہ خوانی میں خود ساختہ اور جھوٹے واقعات کی بھر مار کی شکایت کر کے ان سے ایک کتاب تحریر کرنے کی فرمائش کی تھی جو اس مذموم روش کا سد باب کر سکے۔ حاجی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''یہ ہندوستانی عالم سمجھتے ہوں گے کہ جھوٹی روضہ خوانیاں صرف انہی کے مِلک میں ہوتی ہیں اور نجف و کربلا یا مشہد اور قم میں یہ صورت حال نہ ہو گی اور یہاں سب

اہل منبر سچ ہی بولتے ہوں گےلیکن ان بیچارے کو کیا پتہ کہ ان جھوٹے واقعات کی مرکزی تراش گاہیں تو یہی مقامات ہیں جہاں سے ان کی نشر واشاعت ہوتی ہے اور یہ روضہ خوانی کی منڈیوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔

پھر کہتے ہیں یہ قصور دراصل علماء کا ہے جو ان تصرفات پر تنقید نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے سد باب کی کوئی تدبیر کرتے ہیں اگر یہ لوگ غفلت و مسامحت سے کام نہ لیتے روضہ خوانوں کی ان حرکتوں پر کڑی نظر رکھتے انہیں دروغ بافیوں سے روکتے اور ان پر قدغن بٹھاتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی اور نہ یہ لوگ کھلم کھلا اور بے باکانہ صریح کذب و افترا سے مذہب حق اور اہل مذہب کے لئے وجہ تمسخر بنتے اور نہ ہی یہ محترم اجتماعات اس قدر بے برکت ہوجاتے۔

بہرحال یہ کتاب اس موضوع پر لکھی گئی سب کتابوں میں منفرد ہے اور مجھے بہت تعجب ہے کہ اتنی مفید اور قابل مطالعہ کتاب کی عمومی نشر واشاعت اور ترویج پر کیوں توجہ نہیں دی گئی؟

مجلس خوانی کے لئے قائم کردہ اپنی دونوں شرطوں ''اخلاص'' اور ''راست گوئی'' کے بارے میں مرحوم حاجی نوری نے سیر حاصل بحث کی ہے۔خصوصاً ''راست گوئی''، یعنی بیان واقعات میں تاریخی دیانت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ جھوٹ کے تمام انواع و اقسام پر جس شرح وبسط سے گفتگو کی ہے۔ اس سے اس عظیم عالم کی اخبار و احادیث کے بارے میں وسعت اطلاع کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے اس موضوع پر اتنی مفصل بحث کسی بھی اور کتاب بھی نہیں دیکھی ہے۔

''اخلاص'' کے موضوع پر اپنی بحث کا آغاز انہوں نے روضہ خوانی کی فیس کے مسئلہ سے کیا ہے میں آج شب اس موضوع پر کچھ نہیں کہوں گا بلکہ اخلاص کے دوسرے پہلوؤں پر بحث کروں گا۔

اخلاص کا معنیٰ ہے نیت کی صفائی اور اس کا تقاضا ہے للھیت یعنی انسان

ہر کام خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کرے اور اس میں کسی بھی طرح کی دوسری دنیاوی غرض شامل نہ ہو یعنی جو بھی وہ کرے۔صرف خدا کے لئے ہو غیر خدا کے لئے نہ ہو۔ اب غیر خدا کے لئے کئے جانے والے کاموں کی کچھ قسمیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ پیسے کے حصول کے لئے کیا جائے اس کے علاوہ کچھ دوسری قسمیں بھی ہیں اور میں آج اپنی بحث انہی دوسری قسموں تک محدود رکھوں گا۔ کیونکہ میری نظروں میں ان کی اہمیت اجرت کے مسئلے سے زیادہ ہے۔اور وہ فیس وصول کرنے کے رجحان سے زیادہ خطرناک ہیں۔ ان میں سے ایک کو میں شخصیتوں کی دلالی کا نام دیتا ہوں جب کہ دوسری کو مصلحت گوئی کہا جا سکتا ہے۔

ا۔پہلی قسم

کی صورت یہ ہے کہ منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیٹھ کر کرسی حسینؑ پر بیٹھ کر ہدایت و تبلیغ کی بجائے شخصیتوں کی دلالی شروع کر دی جاتی ہے اور منبر کو اس دلالی کا پلیٹ فارم بنا لیا جاتا ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں منبر کو اس مقصد کے لئے عموما استعمال کیا جاتا۔ یہ دلالی کسی بھی شخصیت یا شخصیات کے لئے ہو سکتی ہے۔ یہ شخصیت سیاسی بھی ہو سکتی ہے اور غیر سیاسی بھی۔ اور دلال بانی مجلس بھی ہو سکتا ہے اور پیش نماز یا اس سے علاوہ کوئی انسان بھی ہو سکتا ہے۔

یہ سب چیزیں ہرگز منبر کے شایان شان نہیں بلکہ اس کی عظمت واہلیت کو کم کرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنے ہر کام کے لئے وجہ جواز تراش سکتا ہے۔لیکن یقین کیجئے کہ ہمارے منبر کی کمزوری بے قدری اور بے اہمیتی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی دلالی ہے۔جس نے منبر کو حسین علیہ السلام کے نام کی تبلیغ کے بجائے معاصر مقتدر شخصیتوں کے حق پروپیگنڈے کا پلیٹ فارم بنا دیا ہے منبر کو بہرحال آج آلودگی سے پاک کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ دوسری قسم

جسے ہم نے بمصداق

وتوقیفهم علی ما اراد من مصلحة دینهم ودنیاهم

مصلحت گوئی کا نام دیا گیا ہے لیکن اس کے بارے میں ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ مصلحت گوئی اور مزاح گوئی میں بڑا فرق ہے جس میں متکلم کا مقصد صرف سامعین کی تفریح خاطر ہوتا ہے تاکہ جواب میں ان سے تحسین بھرے جملے اور واہ واہ کے نعرے وصول ہوسکیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ لوگ اپنے زمانے کے انبیا کے خلاف کیوں رہے ہیں؟ کیوں ہر آنے والے نبی کو اپنے پیش رو سے زیادہ عوامی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا؟ کیوں انبیائے سلف کے پیرو آج کے جعلی پیروں کے مریدوں جتنے بھی نہ تھے اس میں ایک بڑا راز پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انبیاء عوام کے نکات صغف سے جہاد کرتے تھے۔ جب کہ ہم لوگ ان کے نکات ضعف سے استفادہ کرتے ہیں۔

وہ ان کے عیوب اور نکات صنعف کی اصلاح اور ان کا ازالہ چاہتے تھے۔ اور ہم لوگ انہی عیوب اور نکات صغف کو اپنے مفادات کے حصول کے لئے آلہ کار بنانے کے درپے رہتے ہیں اور بانی مجلس اور سامعین کی رضا جوئی کے لئے انہیں محظوظ کرنے والی باتیں تو کرتے ہیں لیکن ان کی عاقبت سنوارنے کی بات نہیں کرتے۔ ہمیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ فلاں قصہ جھوٹا اور من گھڑت ہونے کے علاوہ لوگوں کی ضلالت و گمراہی اور غرور وتکبر کا سبب بھی ہوسکتا ہے لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی خوب معلوم ہوتا ہے کہ سامعین کے لئے ذہنی عیاشی اور ہماری جیب پری کا سامان کرے گا۔ لہٰذا اسے کہہ ڈالنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ اسے پورے برگ و بار کے ساتھ نمک مرچ لگا کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ افسانہ ملاحظہ ہو:۔

غبارِ نجات

''ایک نصرانی اتفاق سے زائرین کربلا کے ایک قافلے میں شامل ہو گیا۔ کربلائے معلیٰ پہنچ کر زائرین تو زیارت کے لئے صدر دروازے سے اندر چلے گئے لیکن نصرانی غیر مسلم ہونے کی وجہ سے باہر ہی رک گیا اور کچھ دیر کے بعد سامان کے پاس سو گیا۔ زائرین کے قافلے اس کے پاس سے گزرتے رہے اور غبار اس کے جسم (نازنین) پر جمتا رہا خواب میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ قیامت برپا ہے۔لوگ گروہ در گروہ جناب سید الشہداء علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں اور ملائکہ ہر ایک جماعت کا آپؑ سے تعارف کروا رہے ہیں کہ یہ فلاں ماتمی کو رہے یہ زنجیر زن دستہ ہے۔ یہ تلوار کے ماتمی ہیں یہ مجلس میں قہوہ تقسیم والے ہیں۔ یہ ماتمیوں کو شربت پلانے والے ہیں۔ یہ آگ پر ماتم کرنے والے جانباز ہیں۔ یہ ماتمیوں پر گلاب چھڑکنے والے ہیں۔ اور امام علیہ السلام ہر جماعت کو حساب کتاب سے بریت کا پروانہ عنایت فرما رہے ہیں۔حتیٰ کہ سب جماعتیں گزر جاتی ہیں اور ہر ایک فرد بھی باقی نہیں بچتا۔لیکن آنحضرتؑ ملائکہ سے فرماتے ہیں ایک شخص باقی ہے جسے تم نے پیش نہیں کیا۔ملائکہ عرض کرتے ہیں حضورؑ کوئی بھی باقی نہیں۔ ہم ملائکہ کیسے غلطی کر سکتے ہیں ہمارے تمام رجسٹر اور تمام فہرستیں مکمل ہیں۔لیکن آپؑ فرماتے ہیں تم سے ضرور غلطی ہوئی ہے ایک نصرانی صدر دروازے پر موجود سویا پڑا ہے نیند کے دوران اس کے پاس سے گزرنے والے میرے زائرین کے قافلوں کی گرد سے اس کا جسم و لباس اٹا پڑا ہے جس کی وجہ سے دوزخ اسے قبول نہیں کر سکے گا اسے بھی نجات کا ایک پروانہ دے دو۔

یہ جیسا کہ میں نے عرض کیا عوام کے نکات ضعف اور ان کی جہالت سے فائدہ اٹھانے اور انہیں گمراہی اور ناجائز غرور میں مبتلا کرنے کی کوشش کی بدترین مثال ہے۔

پیغمبران خدا ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ پوری قوت سے عوام کے نکات ضعف

سے لڑتے اور ان کے خلاف جہاد کرتے تھے انہوں نے ہمیشہ لوگوں کی فلاح ونجات کو مدنظر رکھا ان کی خواہشات کے سیلاب میں نہیں بہہ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی زندگی میں انکے پیروکثرت نہ حاصل کر سکے۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے متبعین کی تعداد میں اضافہ ان کی رحلت کے بعد واقع ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ عوام کے نکات ضعف پر دست اندازی نہیں کر سکتے لیکن انہیں کھو دینے کے بعد عوام پر ان کی نیک نیتی پوری وضاحت کے ساتھ روشن ہو جاتی ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ عوام کو ان کے مصالح سے آگاہ کرنا بحکم **وتوقیفهم علی ما اراد من مصلحة وینهم ودنیا** اہم دو چیزوں یعنی ا۔علم و اطلاع اور ۲۔اخلاص کا متقاضی ہے۔علم و اطلاع کی بھی ہم نے دوقسمیں تفصیلاً بیان کیں۔ ا۔علم دین اور ۲۔علم دنیا۔ اخلاص کے ذیل میں بھی ہم نے اس کے دوضروری تقاضوں کا ذکر کیا:۔کہ

ا۔منبر حسین مختلف شخصیتوں کی دلالی کا پلیٹ فارم نہ بنے۔اور۔

۲۔ معاشرے کے نکات ضعف کے ساتھ جہاد کا محاذ ثابت ہو نہ کہ مصلحت بینی کی وجہ سے فائدہ بری کا ذریعہ۔

۳۔اطلا امت برائے احوال مسلمانا عالم

خطیب کے فرائض کا تیسرا اہم حصہ بمصداق فرمان امام رضا علیہ السلام

ویخبرهم بماورد علیهم من الآفاق من الاحوال التی فیها المضرة والمنفعة۔

مسلمانوں کو عالمی اسلامی برادری کے اوضاع واحوال سے آگاہ رکھنا ہے مطلب فرمان معصوم کا یہ ہے کہ:۔

خطیب کا فرض ہے کہ مسلمانوں کو دور دراز خطوں میں رہنے والے اپنے دینی بھائیوں کے نفع ونقصان اور سیاسی معاشرتی احوال سے باخبر رکھے۔

مثلاً الجزائر میں حادثہ پیش آ جائے تو اس کا فرض ہے کہ اپنی اولین فرصت میں عوام کو اس سے آگاہ کرے نہ کہ اس وقت تک خاموش رہے جب فضائے عالم اس خبر سے گونج نہ اٹھے اور دنیا کے روز نامے اس کی پوری تفصیلات پس منظر اور سیاسی تجزیے شائع نہ کر چکیں اور فرانس کی خفیہ فوج کے جرائم کا مکمل جائزہ نہ پیش کر چکیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خود احوال عالم سے خبردار اور مطلع رہے۔

خفیہ فوج لشکر یزید کی مانند ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر خطیب لشکر یزید کے جرائم کے ذکر کے ساتھ ضمناً اس کے جرائم کا بھی ذکر کر دے کیونکہ یہ لوگ بھی ظلم وستم اور شقاوت قلبی میں یزیدی افواج سے کم نہیں انہوں نے بھی سپاہ یزید کی طرح ہر فرد کو ہر قسم کے ظلم وایذا کا نشانہ بنایا اور کسی بھی انسانیت سوز اقدام سے دریغ نہیں کیا۔ زن و مرد پیر وبرنا بچہ وبیمار کسی کا لحاظ نہ کیا۔ کتب خانے جلائے بستیاں اور آبادیاں برباد کیں ہری بھری کھیتیاں جلائیں اور مظلوموں کی نسل کشی کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا اور فرمودہ خداوندی

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ

کا مصداق بن کر فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ کے مستحق قرار پائے۔

داستان کربلا جسے بہرحال زندہ رہنا چاہئے دراصل ایک تنبیہہ ہے جس کی یاد کو تازہ رکھ کر اسلام پر آئندہ کسی بھی قسم کے خطرات و مصائب کے ورود کا سدباب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ جس کی وجہ سے ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ اسلام پر الجزائر سے بھی بڑے مصائب نازل ہوئے لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

چند روز ہوئے میں نے ایک بہت بڑے عالم دین سے جو مرجع تقلید بھی ہیں

اور تاریخی معلومات بھی ان کی وسیع ہیں دوران گفتگو کہا۔

میں اکثر اندلس (اسلامی اسپین) کے بارے میں سوچتا ہوں کہ وہاں صرف پانچ سال کی مدت میں مسلمانوں پر کیا کچھ مصائب نہیں گزر گئے۔ (اسپین کی اسلامی حکومت ۸۹۰ ہجری میں ختم ہوگئی تھی۔) اتنی بڑی مصیبت اسلام پر نازل ہوئی تمدن اسلامی کا ایک بڑا مرکز ہم سے چھن گیا۔ ہزارہا انسانوں کو قتل کیا اور زندہ جلا دیا گیا۔ مسیحیوں نے ایک مقام پر ۳۰۰۰ ہزار مسلمانوں کو زندہ جلادیا۔ اسپین سے ہجرت کرنے والے دو لاکھ مسلمانوں میں سے جنہیں خود مسیحیوں نے اسپین سے مہاجرت کے اجازت نامے جاری کئے ہوئے تھے ایک لاکھ کو اثنائے مسافرت میں قتل کر دیا۔

گوستان ولوبون جو خود ایک مسیحی ہے لکھتا ہے

> جو مظالم اسپین میں مسیحیوں نے مسلمانوں پر ڈھائے اور اس ضمن میں جن جرائم کے وہ مرتکب ہوئے ان کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی

اور ادھر بے رخی اور ستم ظریفی اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ اس وقت سے آج تک جتنی بھی کتابیں عربی یا فارسی میں لکھی گئی ہیں کسی شخص نے بھی ان میں سے کسی کتاب میں ذکر تک نہیں کیا کہ دنیا میں اسلام کسی بڑے اور المناک حادثے سے دوچار ہوا ہے۔ ہمدردی اور اظہار افسوس تو درکنار کسی نے اس بارے میں زبان تک ہلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بظاہر پہلی کتاب جو اس موضوع پر ایران میں لکھی گئی یہی تاریخ اندلس ہے جسے علامہ آیتی نے تالیف کیا ہے اور تہران یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔

ایسے مسائل کی عوام کی اطلاع کے لئے منبر پر سے تشہیر ہونی چاہئے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جو علاقے اسلامی مملکت سے کٹ کر آج کمیونسٹ دنیا کا حصہ بن چکے ہیں ان میں آپ کے مسلمان بھائیوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا آپ کو پتہ ہے کہ مشرقی ترکستان میں مسلمانوں پر کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ کیا آپ کو کشمیری مسلمانوں کی

حالت زار کا کوئی اندازہ ہے؟ یا بے خانماں فلسطینیوں ہی کے مصائب کی کوئی خبر ہے؟ کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسرائیل کا وجود عالم اسلام کے لئے کتنا بڑا خطرہ ہے؟

اسلام کو درپیش خطرات

آج ہم دو بہت بڑے خطروں سے دوچار ہیں جو عالم اسلام کی خارجی سیاست کے نقطہ نظر سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں ایک کمیونزم ہے اور دوسرا صیہونیت۔

ان میں سے صیہونیت کا خطرہ کمیونزم کے خطرے سے بڑا ہے کیونکہ کمیونزم ایک خالصتاً مادی فلسفہ ہونے کی وجہ سے واضح اور صریح کفر ہے جس کی اسلام دشمنی ایک واضح اور آشکار حقیقت ہے اور یہ دشمن کھلم کھلا ہمارے سامنے صف آرا ہے لیکن صیہونیت ایک منافق دشمن ہے جس نے اپنے منحوس چہرے پر نقاب چڑھا رکھی ہے اور تمام اسلامی ملکوں میں جاسوسی کے جال پھیلا رکھے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ ہر سال کتنے کروڑ ڈالر اس کام پر یہ لوگ خرچ کرتے ہیں۔ یہ دونوں دشمن ظاہری اور باطنی محاذوں پر ہمارے خلاف برسر پیکار ہیں اور قینچی کے دو پھلوں کی طرح اسلام کی شہ رگ کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں اور ان ہر دو خطروں بالخصوص صیہونیت کے خطرے سے ہر طرح سے خبردار رہنا چاہیے۔ آپ نت دن عرب ملکوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں عجیب وغریب خبریں سنتے رہتے ہیں کہ فلاں حکومت کے فلاں حکومت کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ شام اور مصر میں پھوٹ پڑ گئی۔ اردن کی شام کے خلاف سازش!......سعودی حکومت کا یمن کے خلاف اعلان جنگ!......لیکن اس سب کچھ کی تہ میں صیہونی اسرائیلی کارفرما ہوتی ہے۔

مسلمان عوام کو اس خطرے سے آگاہ کرنا ضروری ہے لیکن یہ کام کون

کرے؟ کیا حکومت یہ کام انجام دے جو خود اپنے فرائض کو نہیں پہچانتی؟ سیاسی پارٹیاں انجام دیں جن کے پاس خود لائحہ عمل نام کی کوئی چیز موجود نہیں؟ ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے ایسی توقع فضول ہے۔ آخر کار بہرحال یہ فریضہ اہل منبر ہی کے ذمے رہ جاتا ہے جو اسلام کے نمائندے ہیں یا پھر وہ لوگ انجام دیں جو اسلامی جمہوری مجلس کے ناطق ہیں اور اسلامی اسمبلی کے اسپیکر ہیں۔ اگر ہر حکومت کی اسمبلی کا ایک اسپیکر ہوتا ہے اگر قصر ابیض (امریکی وائٹ ہاؤس) کا ایک اسپیکر ہوتا ہے تو اسلام کا اسپیکر کیوں نہیں ہوسکتا اور اسلام کے اسپیکر خطباء اور اہل منبر حضرات ہی ہیں۔

جو امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

ویخبر هم بما ورد علیهم من الآفاق التی فیها المضرة والمنفعة

خطیب قوم کو دور دراز سرزمینوں میں رہنے والے مسلمانوں کے نفع ونقصان اور سیاسی اور دیگر حالات سے باخبر رکھے۔

یہ خدانخواستہ مذاق تو نہیں ہے۔ بلکہ پوری سنجیدگی اور ذمہ داری سے کیا گیا ایک لازمی ارشاد ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ہم سب سے اس بارے میں سوال ہوگا۔ ہمیں مادہ پرستی اور صیہونیت کی سرگرمیوں سے واقف ہونا چاہئے۔ حکومت سے زیادہ ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ دشمنان اسلام کے مذموم عزائم سے باخبر رہیں۔ حکومت اگر غافل ہو تو ہو۔ ہمیں غافل نہیں رہنا چاہئے بلکہ ہر وقت ان کے باطل عزائم کی شکست کی تدبیروں میں مصروف رہنا چاہئے۔

اگر حسین علیہ السلام کی کرسی اس مقصد کے لئے استعمال ہو تو یقیناً اسلام کی محافظ ثابت ہوگی ار یہی عزاداری کا فلسفہ ہے ورنہ حسین علیہ السلام پر ہمارے گریہ کا کیا فائدہ ہے اور انہیں ہمارے آنسوؤں کی کیا احتیاج ہے۔؟ ان کی ضرورت تو صرف یہ ہے کہ ان کا نام زندہ رہے ان کا مکتب زندہ رہے جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ہم باطل کے خلاف

جہاد کریں۔ کمیونزم کے خلاف برسر پیکار ہوں۔ظلم بے انصافی فساد خواحش جوا بازی اور شراب خوری جیسے قبیح اعمال کے خلاف اعلان جنگ کریں۔ اور

اشهد انك قد اقمت الصلوٰة وآتيت الزكاة وامرت بالمعروف ونهيت عن المنكر وجاهدت فی الله حق جهاده۔

کی صرف زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے تصدیق کریں تا کہ روز حشر بحضور سید الشہداء سرخرو ہوں اور فخر سے کہہ سکیں کہ دنیا میں ہمارے جانبازانہ اعمال راہ حق میں ہماری فداکاریاں نام حسین ذکر حسین اور یاد حسین کے احیاء ہی کی کوششوں کے سلسلے کی کڑیاں تھے اور اگرچہ ہم اپنی اس عاقبت سے بھی راضی ہیں لیکن **یالیتنیٰ کنامعکم فنفوز فوزا عظیما** کاش ہم کربلا میں آپ کے ساتھ موجود ہوتے تو پھر ہمارے علو مراتب کی بات ہی کیا تھی۔ یہ جو سوا تیرہ صدیاں پہلے رونما ہونے والے سانحے میں ہمیں شرکت کی حسرت ہے اور یہ کوئی معمولی سی جذباتی خواہش نہیں بلکہ ایک نہایت غیر معمولی امر ایک انتہائی عظیم الشان پیغام اور ایک بہت بڑے اصولی مکتب کے احیاء کی ایک نہایت سنجیدہ تمنا ہے یہ حسرت ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ اس مکتب کی تعلیمات کی روشنی میں حسین علیہ السلام کے پرچم کے سائے میں حق کی راہ پر گامزن اور باطل کے خلاف مصروف جہاد رہیں۔

شب عاشور بھی کیا شب تھی! یہ عجیب شب حسین علیہ السلام اور آپؑ کے یاران جانثار پر کیسے گزری؟ کیا یہ تاریک رات تھی جس کے اندھیروں میں انہوں نے زندگی کی راہیں کھودی تھیں یا پھر کیا یہ ایک روشن رات تھی۔ غیرت روز روشن رات جس میں انہوں نے اپنی زندگی کی قطعی راہ متعین کی تھی۔ یہ سوال اس چراغ سے کیا جائے جو گل ہو کے بھی اس رات کی نورانیت گھٹا نہیں سکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ۔

شب مردان خدا روز جہاں افروزاست

روشناں راتحقیقت شب ظلمانی نیست
رات ہے شب زندہ داروں کے لئے دن کا پیام
ظلمت شب نور ہے روشن ضمیروں کے لئے

آپؑ نے ایک شب کی مہلت طلب فرمائی تا کہ اپنے خالق حقیقی کے ساتھ جی بھر کے راز و نیاز اور مناجات کرسکیں اور اس سے ملاقات کی تیاری کرسکیں۔

راوی کا بیان ہے کہ اس رات یزیدی فوج کے تیس سپاہی خیمہ گاہ حسینؑ کے نزدیک سے گزرے تو اندر سے گونج کی سی آواز ان کے کان میں پڑی۔ وہ مزید نزدیک آ گئے تا کہ اندر کی صورت حال کا اندازہ کرسکیں اور قنات خیمہ سے کان لگا کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ یہ گونج تسبیح وتہلیل اور دعا و مناجات کی تھی اور لھم دوی کدوی النحل (شہد کی مکھیوں کے چھتے جیسا زمزمہ ان کی آوازوں سے پیدا ہو رہا تھا۔) کسی کی زبان پر رکوع کی حالت میں سبحان ربی العظیم وبحمدہ کے الفاظ تھے تو کوئی سجدے میں گرا سبحان ربی الاعلیٰ کہہ رہا تھا۔ کوئی قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھا تو کوئی تسبیح و تقدیس الٰہی میں محو تھا۔ سپاہی اس مسحور کن پاکیزہ ماحول میں کھو گئے اور یک زبان ہو کر بے ساختہ بول اٹھے ہم بہت بڑے دھوکے میں رہے۔ پھر امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے کیے پر پچھتائے اور تائب ہو کر جان نثاروں میں شامل ہو گئے۔

یہ رات صبح تک سب نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کی اپنا اسلحہ تیز کیا۔خیموں کی ترتیب میں کچھ ترمیم کی اور ہر طرح سے خود کو اگلے دن کی جنگ کے لئے تیار کیا۔ پھر اصبح الحسین فصلی باصحابه الفجر ثم قام خطیبا

علی الصباح امام حسین نے اپنے اصحاب با صفا کے ساتھ نماز فجر ادا کی اور پھر ان سے مختصر خطاب فرمایا اور۔

حمد الله واثنیٰ علیه وقال لا صحابه ان الله عزوجل

قد اذن فی قتلی وقتلھم الیوم۔

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آج میرے اور آپ سب کے قتل کا اذن صادر ہو چکا ہے۔ پھر آپؑ نے دعا فرمائی۔

اللھم انت ثقتی فی کل کرب ورجای فی کل شدۃ و انت لی فی کل امرنزل بی ثقۃ وعدۃ۔ کم من ھم تضعف فه الفوادوتقل فیه الحیله ویخذل فیاء الصدیق ویشمت فیه العدوانزلته بك وشکوته الیك رغبة منی الیك عمن سواك ففوجته عنی و کفیتنه مانت ولی کل نعمة وصاحب کل حسنة ومنتھی کل رغبة۔

پروردگار ہر مصیبت میں میرا اعتماد صرف تیری ذات پر ہے اور ہر مشکل میں میری امید تو ہے تو مجھ پر نازل ہونیوالی ہر ابتلاء میں میرا سہارا اور میرے دل کی طاقت ہے۔ اے اللہ کتنے ہی تفکرات ایسے ہوتے ہیں جن میں دل کمزور اور تدبیر ناکام ہو جاتی ہے۔ دوست ساتھ چھوڑ دیتا اور دشمن بغلیں بجاتا ہے۔ جب بھی میں نے تجھ سے فریاد کی اور سب سے منہ موڑ کر تیری بارگاہ میں رجوع کیا تو تو نے مجھ سے مصائب کو دور فرمایا اور ان سے مجھے اپنے حفظ وامان میں رکھا۔ تو میرا ولی نعمت محسن اور ملجا وماویٰ ہے۔

سپاہ یزید میں سے ایک شقی ابدی شب خون کے ارادے سے خیمہ گاہ کی پشت پر آیا لیکن جب اس نے راہ مسدود پائی تو گستاخی اور بدزبانی پر اتر آیا۔ اصحاب الیمین میں سے ایک نے اجازت چاہی کہ ایک تیر سے اس کو کیفر کردار تک پہنچا دیں لیکن آپؑ نے اجازت نہ دی انہوں نے عرض کیا:۔

مولا یہ بہت بڑا فاسق اور شقی ہے میں اسے خوب پہچانتا ہوں۔لیکن آپؑ نے فرمایا:۔

میں جنگ میں ابتداءنہیں کرتا۔

اس سے آپؑ کا مقصد اتمام حجت تھا۔

روز عاشوراء آپ نے کئی بار فوج اشقیاء سے خطاب فرمایا ہرطرح سے انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش فرمائی اور پورا پورا اتمام حجت کیا لیکن بدبخت یزیدیوں پر قطعاً کوئی اثر نہ ہوا۔

بلکہ عمر سعد تو اثر لینے کی بجائے اور بھی زیادہ گمراہی کی پستیوں میں اتر گیا اور جونہی طرفین روبرو ہوئے تو سب سے پہلا تیر اسی نے حزب اللہ پر پھینکا اور کہنے لگا۔

لوگو ابن زیاد کے سامنے گواہ رہنا کہ حسین علیہ السلام کی طرف پہلا تیر میری کمان سے نکلا تھا۔ اس کے بعد تیروں کی بارش شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں بہت سے اصحاب حسین علیہ السلام زخمی ہوگرے۔

اب میں چند لفظ سید الشہداء علیہ السلام کے وداع کے دردناک منظر کے بارے میں کہوں گا۔

عاشوراء کی ظہر ڈھل چکی ہے سب اعزاء وانصار آپؑ کی آنکھوں کے سامنے شہید ہو چکے ہیں اور ان کے جسد ہائے پاک آپؑ کے اردگرد بکھرے پڑے ہیں۔

نظر الی اثنین وسبعین رجلامن اهل بیته واصحابه صرعی

آپ نے اپنے اہل بیت و انصار کے بہتر ۷۲ لاشوں پر ایک نظر ڈالی اب انہیں ایک ایک کر کے آپؑ کو اٹھا کر خیمہ گاہ تک لے جانا ہے ان میں حبیب ابن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ جیسے باوفا جاں نثار ہمشکل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی اکبر اور قاسم و علی اصغر جیسے لخت جگر ہیں قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباس جیسے قوت بازو بھائی ہیں۔

اب تمام شہدائے راہ خدا کے لاشوں کو آپؑ ایک خیمے میں منتقل کر کے پہلو بہ

پہلو لٹا چکے ہیں لیکن دو لاشے یہاں نظر نہیں آ رہے نہ علی اصغر کا لاشہ یہاں موجود ہے نہ عباسؑ کا۔ معلوم ہوتا ہے شیر خوار کو آپؑ نے پامال ہونے کے اندیشے سے کہیں دفن کر دیا ہے لیکن ابو الفضل یہاں کیوں نہیں ہیں؟ جب سید بحر العلوم سے ہم نے پوچھا تو وہ رو دیئے اور بولے عباسؑ کے بدن کو اشقیاء نے اس قدر پارہ پارہ کر دیا ہوا تھا کہ سب کو اکٹھا کر کے لانا امام علیہ السلام کے بس میں نہ تھا۔

اس کے بعد آپؑ التفت الی الخیمة خیمہ گاہ کے نزدیک تشریف لائے اور درِ خیمہ پر کھڑے ہو کر نادی آواز دی۔

یا سکینة، یا فاطمة، یا زینب، یا ام کلثوم، علیکن منی السلام۔

بیٹی عرض کرتی ہیں

یا ابت استسلمت للموت؟

بابا جان! آپ واقعی موت پر راضی ہو گئے ہیں؟ جواب دیتے ہیں۔

نور چشم نرغہ اعداء میں تنہا گھرا ہوا شخص کیسے موت سے بچ سکتا ہے آپؑ کو وداع کا ایک اور موقعہ ملا جس کی وجہ یہ تھی کہ آپؑ نے نہر فرات کی طرف سپاہ یزید پر حملہ کر کے چار ہزار تیر اندازوں کو بھگا دیا اور اس کی صفیں درہم برہم کر دیں فرات پر پہنچے تو پانی میں داخل ہو گئے اور جیسے کہ گھوڑے سے مخاطب ہو کر فرمایا پانی پی لے۔ لیکن اسپ باوفا نے اپنا سر اور بلند کیا جیسے کہ جواب دے رہا ہے مولا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ آپؑ تو پیاسے رہیں اور میں سیراب ہو جاؤں۔ اتنے میں افواج یزید میں سے ایک شخص نے آواز دی۔

حسین آپ خود تو پانی پینے کی فکر میں ہیں جب کہ آپ کے حرم پر حملہ ہو رہا ہے۔

اس طرح آپؑ دوسری بار خدا حافظی کے لئے خیمہ گاہ میں شریف لائے۔ اہل حرم کو صبر و تحمل کی تاکید کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اجر کریم کا وعدہ انہیں یاد دلایا۔ ان سے فرمایا۔

میرے بعد تم سب کو قیدی بنا لیا جائے گا۔ اس لئے ابھی سے قیدیوں کا لباس پہن لو ہر قسم کے مصائب و مصاعب کے مقابلے کے لئے تیار رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حافظ و نگہبان ہو۔ دشمن جتنا بھی ظلم کریں صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا اور کوئی ایسا لفظ تمہاری زبان پر نہ نکلے جو تقدیر خداوندی پر رضائے مطلق کے منافی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں تم ہی معزز و محترم ہو جب کہ تمہارا دشمن حقیر و ذلیل ہے عاقبت تمہاری ہی ہے اور تمہارے دشمن کے لئے خزی الدنیا دنیا میں ذلت و خواری اور عذاب الاخرۃ آخرت میں عذاب و رسوائی مقدر ہو چکی ہے۔

سبحان اللہ! کیا ایمان اور کتنا اطمینان ہے۔ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد بھی رضا کی کس منزل پر ہیں۔ اپنے عظیم مقصد میں کامیابی کی روحانی مسرت کا نور رخ اقدس سے پھوٹ رہا ہے۔ چہرے کے تیور **فزت و رب الکعبہ** کے تاثر سے دشمن کی شکست فاش کا اعلان کر رہے ہیں **وفیت بوعدی** کا یقین واطمینان

يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ [1]

کی نوید سنا رہا ہے۔

یہ آخری وداع ہے۔ اب آپؑ لوٹ کے نہیں آئیں گے۔ اب آپؑ شہید ہونے تک جنگ کریں گے لیکن یہ کیا جنگ ہے! نہ چشم فلک نے کبھی ایسی جنگ دیکھی نہ گوش کائنات نے کبھی سنی۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے۔

---

[1] سور الفجر: ۲۷ ۲۸

فواللہ مارایت مکثو وأقط قدقتل
ولدہ واھل بیتہ واصحابہ اربط جاشاً منہ
میں نے دیکھا مظلوم کبھی نہیں دیکھا کہ جس کے فرزند و برادر اور یاران و اصحاب اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو جائیں اور خود بھی زخموں سے چور ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کی شجاعت کا یہ عالم ہو کہ تلوار سونت کر جس طرف بھی رخ کرے ہزاروں مسلح دشمن اس کے سامنے اس طرح بھاگیں کہ گویا بھیڑیں ہیں جو بپھرے ہوئے شیر سے بھاگ رہی ہیں۔

خیمہ گاہ سے قریب ہی ایک جگہ کو آپ علیہ السلام نے ''نقطہ یورش'' قرار دیا ہوا تھا تا کہ آپ علیہ السلام کی آواز خیمہ گاہ تک پہنچ سکے۔ حملے کے وقت آپ علیہ السلام اس نقطے سے زیادہ دور نہیں جاتے تھے تا کہ خیمہ گاہ پر بھی نظر رہے۔ حملے کے بعد جونہی واپس تشریف لاتے تو اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی موجودگی کی خبر جملہ

لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم

سے دیتے کہ کوئی حرکت کوئی طاقت اور کوئی عمل تیری مشیت وارادہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر جنگ ہے تو اس کی قوت وقدرت بھی تو ہی نے دی ہے۔ اگر صبر ہے تو بھی تیری ہی توفیق سے ہے اور اگر شکر و رضا ہے تو بھی تیری ہی نگاہ کرم سے ہے۔ میرا جو کچھ بھی ہے تیرا ہی تو ہے دنیا میں تو ہی تو ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ پیاس سے کانٹا بنی ہوئی زبان سوکھی ہوئے منہ میں کیسے حرکت کرتی ہوگی۔

فوقف یستریح ساعۃ۔

تھوڑی دیر ستانے کے لئے آپؑ ٹھہر جاتے ہیں ایک شقی کے پتھر کی ضرب سے جبین اقدس سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ دامن سے اسے پوچھنے کا ارادہ کرتے ہیں کہ ایک شقی ازلی سینہ مبارک میں زہر آلود تیر اتار دیتا ہے۔

چناں برخودنگہداری کی یا ایں بے نیازی ہا
شہادت بروجود خود زخون دوستان خواہی

بسم اللہ وباللہ وعلی ملۃ رسول اللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم و صلی اللہ تعالیٰ علی محمد وآلہ الطیبین الطاہرین۔